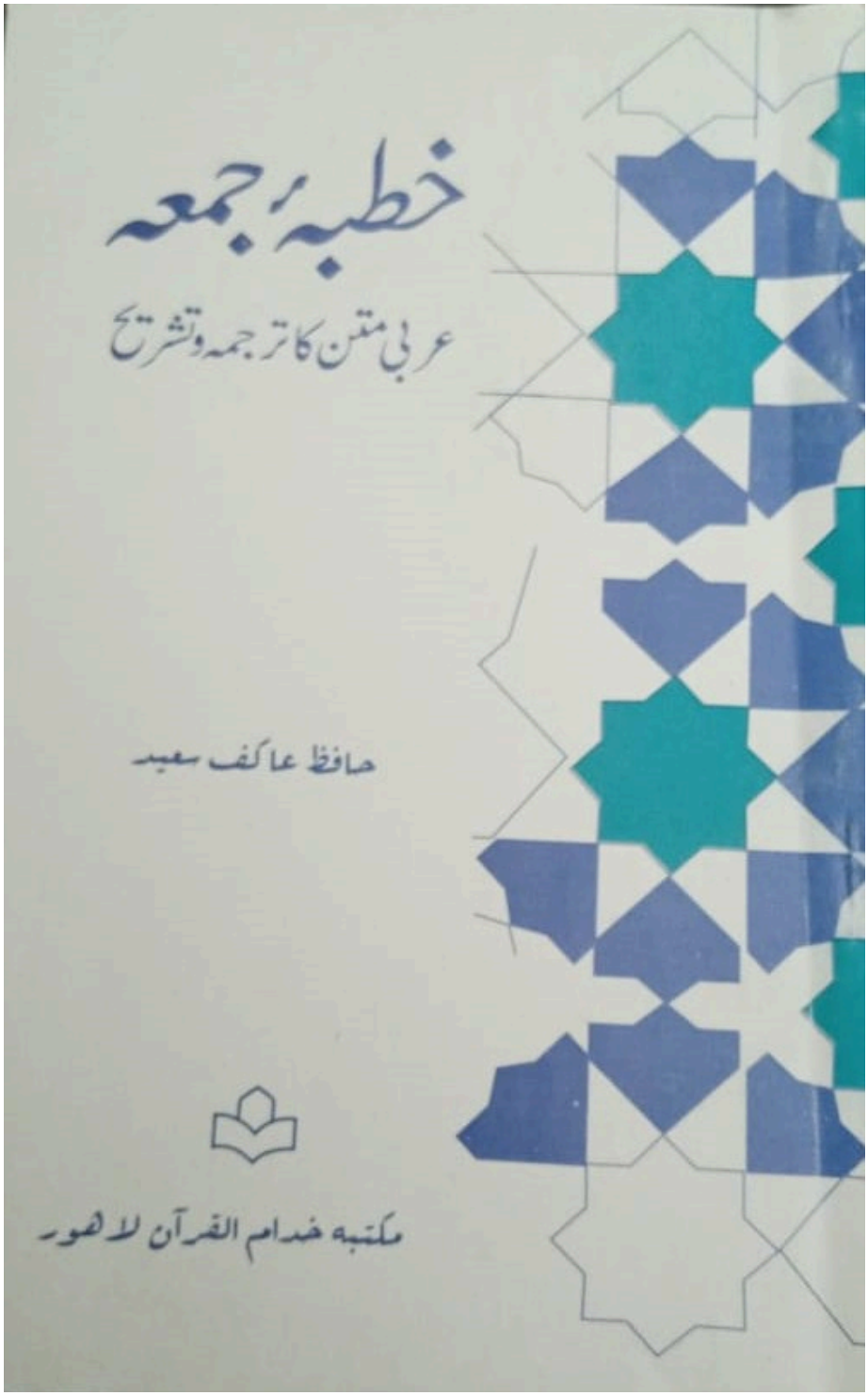


خطبۂ جمعہ عربی متن کا ترجمہ و تشریح

حافظ عاکف سعید

بسم اللہ الرَّحمٰن الرَّحیم

تقدیم

اسلام کے نظامِ تعلیم و تربیت میں خطبۂ جمعہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مقصد بعثت کی تکمیل یعنی "اظہار دین الحقّ علی الدّین کلہ" کے لیے جو حزب اللہ وجود میں آئی' اجتماعِ جمعہ دراصل اس کے ہفتہ وار اجتماع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس پروگرام میں اصل اہمیت خطبۂ جمعہ کی ہے۔

خطبۂ جمعہ کی اہم ترین غرض و غایت تذکیر بالقرآن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جہاں خود اپنے لیے "الذکر" کا لفظ استعمال کرتا ہے وہاں خطبۂ جمعہ کو بھی "ذکر اللہ" قرار دیتا ہے۔ اور یہی حکمت ہے اس میں کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز میں بالعموم سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے جن میں اسی "تذکیر" کا حکم نہایت شد و مد سے آیا ہے۔ یعنی {فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۘ﴿ ۹ ﴾} (الاعلیٰ) اور {فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۙ﴿ ۲۱ ﴾} (الغاشیۃ) رسول اللہ ﷺ کی جس حدیث میں جمعہ کے لیے جلد آنے کی فضیلت کے درجے بیان ہوئے ہیں اس کے آخر میں وارد ہونے والے الفاظ خطبۂ جمعہ کی اہمیت و فضیلت اور اس کی غرض و غایت کس قدر دوٹوک انداز میں بیان کر رہے ہیں:

((فَاِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ طُوِيَتِ الصُّحُفُ وَرُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَاجْتَمَعَتِ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ الْمِنْبَرِ يَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ فَمَنْ جَاءَ بَعْدَ ذٰلِكَ جَاءَ لِحَقِّ الصَّلَاةِ لَيْسَ لَهٗ مِنَ الْفَضْلِ شَيْءٌ)) (موطأ امام مالک)

''پھر جب امام (خطبہ دینے کے لیے) نکلتا ہے تو (حاضری کے) رجسٹر لپیٹ دیے جاتے ہیں اور قلم اٹھا لیے جاتے ہیں اور فرشتے منبر کے پاس توجہ سے خطبہ سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ تو جو شخص اس کے بعد آیا وہ صرف نماز ادا کرنے کے لیے آیا ہے' (جمعہ کی) فضیلت میں سے اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے!''

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ اجتماعِ جمعہ کی اصل فضیلت خطبہ کی وجہ سے ہے اور خطبہ کی اصل غرض و غایت "تذکیر" ہے' یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ تذکیر کے ضمن میں

قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ یہ حکم موجود ہے: {فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾} (قٓ) ''(اے نبی ﷺ !) آپ اس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دیں جو میری تنبیہہ سے ڈرے''۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے خطبہ ٔجمعہ کے بارے میں احادیث شریفہ میں آتا ہے کہ اس میں آپ ﷺ قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور لوگوں کو تذکیر فرماتے تھے۔

دورِ نبوت سے بعد زمانی بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں دین کی حقیقی روح نظروں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور عبادات کی ظاہری ہیئت ہی اصل اہمیت اختیار کرتی چلی گئی۔ بقول اقبال ع

''رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی !''

چنانچہ خطبہ جمعہ کی حیثیت بھی چند رٹے رٹائے عربی الفاظ حاضرین کو سنا دینے سے زیادہ نہ رہی' اور چونکہ ہمارا معاملہ ع

''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم''

والا ہے کہ عوام الناس ہی کیا' زیادہ تر خطیب حضرات بھی عربی سے نابلد ہوتے ہیں ' لہٰذا اس کی تلافی کے لیے تقریروں اور وعظوں کا سلسلہ مروّج ہے جن میں اور تو سب کچھ ہوتا ہے مگر یہ (اِلا ماشاء اللہ) تذکیر بالقرآن سے خالی ہوتی ہیں جس کے لیے یہ سارا نظام تجویز کیا گیا تھا۔

مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ ایک طویل عرصے تک خطاب جمعہ کی ذمہ داری ادا کرتے رہے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے خطاباتِ جمعہ میں تذکیر بالقرآن کا عنصر غالب رہا ہے۔ اب یہ ذمہ داری امیر تنظیم اسلامی و ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی لاہور حافظ عاکف سعید صاحب ادا کرتے ہیں۔ دسمبر ۲۰۰۴ء تا فروری ۲۰۰۵ء کے دوران چھ خطاباتِ جمعہ میں محترم حافظ صاحب نے خطبہ جمعہ کی اہمیت اور غرض و غایت بیان کرنے کے بعد خطبہ ٔجمعہ کے عربی متن کا اردو ترجمہ اور اس کی تشریح و وضاحت بیان فرمائی۔ ان خطاباتِ جمعہ کی تلخیص ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی کے معتمد ذاتی جناب محمد خلیق نے تیار کی' جو قبل ازیں :ہفت روزہ ندائے خلافت اور ماہنامہ میثاق میں سلسلہ وار شائع ہوتی رہی ہے۔ اب اسے یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

حافظ خالد محمود خضر
مدیر شعبہ مطبوعات

عربی متن کا مفہوم

خطبۂ جمعہ کی اہمیت اور غرض و غایت

خطبۂ جمعہ کی اصل غرض و غایت کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید اور آنحضور ﷺ کے معمول کو دیکھنا چاہیے کہ خطبۂ جمعہ کا اصل مقصد کیا تھا اور اجتماعِ جمعہ کا یہ عظیم نظام کن مقاصد کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ آج ایسے مسلمان جو پنج وقتہ نماز نہ بھی پڑھتے ہوں' ان کی بھی ایک بڑی تعداد نہا دھو کر اور حتی الامکان صاف ستھرے کپڑے پہن کر نہایت اہتمام سے خطبۂ جمعہ کے لیے مسجد میں پہنچتی ہے۔یہ سب کچھ ایک بہت عظیم نظام کے کچھ کھنڈرات ہیں کہ جو باقی ہیں۔

قرآن مجید کے اٹھائیسویں پارے کی سورۃ الجمعہ کا شمار ان چند سورتوں میں ہوتا

ہے جن کے مندرجات کے ساتھ اُن کے نام کی بڑی گہری معنوی نسبت ہے۔ دو رکوعوں پر مشتمل اس سورت کے دوسرے رکوع میں تو واضح طور پر خطبۂ جمعہ کی اہمیت اور اس کے آداب پر گفتگو ہے۔ پہلے رکوع کے مضمون کا بظاہر کوئی تعلق نظامِ جمعہ سے نظر نہیں آتا' لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت اس میں خطبۂ جمعہ کی غرض و غایت ہی بیان کی گئی ہے۔ اس کی دوسری آیت میں آنحضور ﷺ کے اُس عملِ تربیت کا ذکر ہے جس کے

ذریعے سے آپؐ نے ایک ایسی عظیم انقلابی جماعت کو تشکیل دیا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے وقت کی دو بڑی طاقتوں کو قدموں تلے روند کر تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کر دیا۔

اس انقلابی عمل کے لیے قرآن مجید نے چار الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ چنانچہ فرمایا گیا : {ہُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ} ''وہی ہے(اللہ) جس نے اُمّیین کے اندر ایک رسول خود اُنہی میں سے اٹھایا۔ وہ ان (اپنی قوم) کے سامنے (اللہ کی) آیات تلاوت کرتے ہیں' اوراُن کا تزکیہ کرتے ہیں''۔ یعنی آیاتِ الٰہی کی تلاوت کے نتیجے میں جو لوگ حق کا اعتراف کر لیں اور اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر یہ امر تسلیم کر لیں کہ کل کائنات اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے' آپؐ ان کے قلب اور نفس کو پاک کرتے ہیں۔ از روئے قرآن تزکیہ کا اصل ذریعہ بھی خود قرآن ہی ہے۔ آگے ارشاد ہوا: {وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ۚ} ''اور وہ (رسول) انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں''۔ کتاب سے مراد اگرچہ پورا قرآن بھی ہے' لیکن درحقیقت لفظ ''کَتَبَ'' کے معنی کسی چیز کو فرض کر دینے اور لکھنے کے ہیں۔ لہٰذا لفظ کتاب کے اندر اصل اشارہ احکامِ شریعت کی طرف ہے۔ چوتھی بات یہ آئی کہ رسول صرف احکامِ شریعت ہی نہیں بتاتے بلکہ عقل و دانش کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ کوئی چیز فرض کیوں کی گئی ہے' فلاں شے حرام کیوں ہے' یہ باتیں حکمت دین کے ذیل میں آتی ہیں۔ اسی طرح فکری رہنمائی جسے فلسفی اور دانشور اپنا موضوع سمجھتے ہیں' وہ بھی اسی قرآن مجید میں ہے۔

مکی دَور میں آنحضور ﷺ نے مسلسل تیرہ برس صرف یہی چار کام کیے ہیں ۔یہ

چار الفاظ قرآن مجید میں چار مختلف مقامات پر آئے ہیں:تلاوتِ آیات' تزکیہ' تعلیم کتاب' تعلیم حکمت۔ ذرا غور کرنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ چاروں کام قرآن کی تعلیم ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے احکاماتِ شریعت بھی ہیں' آیات کے ذریعے انسان کی باطنی بیماریوں کا علاج بھی موجود ہے' اور پھر حکمت کی اعلیٰ ترین سطح بھی قرآن ہی کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ سارا کام قرآن کے گرد ہی گھوم رہا ہے۔قرآن ہی کی بدولت عرب قوم کی سوچ' اس کے نقطۂ نظر' اندازِ فکر' اخلاق و کردار اور سیرت غرض ہر شے میں تبدیلی آئی' جو ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ بنی ۔ اس انقلاب کے اثرات کو باقی رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ قرآن کے ساتھ رشتہ مضبوط رہے۔ چنانچہ جمعہ کا نظامِ اصل میں اسی تعلیم قرآن پر مبنی ہے۔

سورۃ الجمعہ کی پانچویں آیت میں بنی اسرائیل کے حوالے سے فرمایا گیا کہ: {مَثَلُ الَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىۃَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡہَا} ''مثال اُس قوم کی جس پر لادی گئی تھی تورات 'پھر انہوں نے اس کو نہیں اٹھایا''۔ یعنی کتاب کے ضمن میں عائد ہونے والی ذمہ داری کو ادا نہیں کیا۔ بنی اسرائیل کو اللہ نے جو کتاب (تورات) دی تھی اس میں ہدایت بھی تھی اور روشنی بھی' لیکن اُس قوم نے اِس نعمت کی قدر نہیں کی اور کتاب کے ساتھ اپنے رشتے کو کمزور کر لیا۔ چنانچہ

اب اللہ کی نگاہ میں ان کی کیا حیثیت ہے‘ اس کے بارے میں آگے فرمایا گیا: {کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ} ’’ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ (اپنی پیٹھ پر) اٹھائے ہوئے ہو‘‘۔ غور کیجیے کہ عظیم ترین نعمت کی ناقدری کرنے پر اللہ کی نگاہ میں یہ مقام رہ جاتا ہے! اسی لیے قرآن حکیم کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کو برقرار رکھنے اور اس کی ہدایت سے مسلسل فائدہ اٹھانے کے لیے جمعہ کا نظام ترتیب دیا گیا۔

نبی کریم ﷺ کے خطبۂ جمعہ کی کیفیت احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: ((کَانَتْ لِلنَّبِیِّ ﷺ خُطْبَتَانِ یَجْلِسُ بَیْنَھُمَا یَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَیُذَکِّرُ النَّاسَ)) ’’نبی ﷺ جب خطبہ ارشاد

فرماتے تھے تو اس کے دو حصے ہوتے تھے‘‘۔ (یہاں خطبے سے مراد خطبۂ جمعہ ہے)۔ ’’دونوں کے درمیان آپؐ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھتے تھے‘‘۔ یہ اس خطبہ کی ظاہری ہیئت تھی۔ اس میں کیا کہا جاتا تھا‘ اس کے بارے میں آگے بیان ہے۔ ’’آپؐ قرآن کی آیات پڑھتے تھے اور لوگوں کو تذکیر اور نصیحت فرماتے تھے‘‘۔ یہ ہے خطبۂ جمعہ کی غرض وغایت‘ جس کا ایک معنوی تعلق آنحضور ﷺ کے اس عمل کے ساتھ بنتا ہے جو سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں مذکور ہے۔ یہ کام حضور اکرم ﷺ پر آکر ختم نہیں ہو گیا بلکہ قیامت تک جاری رہے گا۔ جب تک کل کرۂ ارضی پر اللہ کا دین قائم اور غالب نہیں ہو جاتا یہ مشن ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔

بنیادی طور پر نبی کریم ﷺ کو جو مشن دیا گیا تھا‘ وہ انقلابی تھا۔ اس کا ذکر سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۳‘ سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصف کی آیت ۹ میں موجود ہے‘ جن کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا: ایک الہدیٰ‘ یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چلنے والے آسمانی ہدایت کے سلسلے کا فائنل اور کامل ایڈیشن‘ دوسرے دین الحق‘ یعنی نظامِ عدلِ اجتماعی۔ یہ دو چیزیں دے کر رسول اللہ ﷺ کو اس لیے بھیجا گیا تاکہ وہ اللہ کے اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیں۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اس مشن کو آنحضور ﷺ نے بنفس نفیس مکمل فرما دیا تھا‘ تاہم اس آیت کی تکمیل کما حقہ‘ اُس وقت ہوگی جب پورے کرۂ ارضی پر یہ نظام نافذ ہوگا۔ ایک باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر دین حق کو قائم کرنے کے لیے انقلابی افراد درکار تھے۔ ایسے لوگ تیار کرنے کے لیے پہلے اُن کے اندر کی دنیا کو بدلا گیا۔ آنحضور ﷺ نے یہ عمل چار افعال کے ذریعے انجام دیا‘ جن کا ذکر سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں کیا گیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی قوم کے سامنے قرآنی آیات تلاوت کیں‘ اپنے ساتھیوں کا تزکیہ کیا‘ انہیں احکامِ شریعت بتائے اور حکمت و دانش کی تعلیم دی۔ افراد کی یہ قلب ماہیت عالمی اور ظاہری انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔ مسلمانوں کا انقلابی لٹریچر قرآن مجید ہے‘ اس لیے کہ یہ چاروں چیزیں قرآن ہی کے گرد گھوم رہی

ہیں۔ تزکیہ اور باطنی بیماریوں کے علاج کا اصل ذریعہ قرآن ہے' اسی طرح احکامِ شریعت کا سب سے بڑا منبع بھی یقینی طور پر قرآن مجید ہے' جبکہ عقل و دانش کے حوالے سے یہ الحکیم کا کلام ہے' چنانچہ اس سے زیادہ پُر حکمت اور کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔

اِس انقلابی لٹریچر سے مسلسل استفادہ کرتے رہنے اور ایمانی جذبہ کو تروتازہ رکھنے کے لیے قیامت تک کے لیے جمعہ کا نظام تجویز کر دیا گیا۔ یومُ الجمعہ کی کچھ ساعات کا بھی تعین کر دیا گیا کہ جب نمازِ جمعہ کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد کی طرف لپکو اور ہر قسم کا کاروبار چھوڑ دو۔ ان اوقات کے اختتام کے حوالے سے بھی بتا دیا گیا کہ جب نماز مکمل ہو جائے تو اس کے بعد منتشر ہو سکتے ہو۔ سابقہ اُمت کے مقابلے میں اِس اُمت کے لیے یہ خصوصی رعایت ہے کہ وہاں ''سبت'' کا پورا دن کاروبار کو حرام کرتے ہوئے اللہ کی یاد کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ تاہم فضیلت اسی میں ہے کہ مسلمان جمعہ کا پورا دن اللہ کی یاد اور اس کی کتاب کا علم حاصل کرنے کے لیے فارغ رکھیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ متفق علیہ حدیث کے مطابق جو شخص جمعہ کے روز اچھی طرح نہا دھو کر نمازِ جمعہ کے لیے پہلی ساعت میں پہنچتا ہے اس کے لیے ایک اونٹ صدقہ کرنے کے برابر ثواب ہے۔ دوسری ساعت میں پہنچنے والے کو گائے صدقہ کرنے' تیسری ساعت میں پہنچنے والے کو ایک مینڈھا صدقہ کرنے' چوتھی ساعت میں پہنچنے والے کو ایک مرغی صدقہ کرنے' جبکہ پانچویں ساعت میں پہنچنے والے کو ایک انڈا صدقہ کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ جب امام خطبے کے لیے نکلتا ہے تو فرشتے اپنے رجسٹر لپیٹ دیتے ہیں اور وہ بھی ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ گویا جب خطبۂ جمعہ شروع ہو جائے تو پھر یہ فضیلت ختم ہو گئی' اب محض نماز میں شرکت شمار ہوگی۔

خطبۂ جمعہ اور نظامِ جمعہ کی اہمیت کے حوالے سے ایک دو باتیں اور عرض کر دوں ۔ احادیث میں ایک تو اس امر کی تاکید ہے کہ مسلمان اجتماعِ جمعہ کے لیے بڑے اہتمام سے مسواک کر کے' نہا دھو کر' صاف ستھرے کپڑے پہن کر' خوشبو لگا کر آئیں' تاکہ ایک عمدہ ماحول قائم ہو جس میں آدمی پوری یکسوئی کے ساتھ سیکھنے کی طرف متوجہ ہو۔ خطبہ

جمعہ سننے کی اہمیت کا اندازہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح مسلم کی اس روایت سے ہوتا ہے' جس کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن اگر تم نے خطبے کے دوران اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ خاموش رہو تو تم نے بھی لغو حرکت کی۔ اس بیان کی جامعیت دیکھئے کہ چند الفاظ میں کتنی عمدگی سے خطبۂ جمعہ کی اہمیت کو سمو دیا گیا۔ گفتگو سے کسی دوسرے کو روکنا بھی اگر لغو حرکت ہے تو خود بات کرنا اور خطبے کے اندر خلل ڈالنا کتنی قابل

مذمت شے ہوئی' اس کا اندازہ خود کر لیجیے !

خطبۂ جمعہ در حقیقت تعلیم قرآن کا پروگرام ہے۔ قرآن کو بیان کرتے ہوئے ہمیں نبی کریم ﷺ کے فرمودات کے ذریعے ہی سے اس کو سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ خطبہ قرآن و حدیث کا مجموعہ ہونا چاہیے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس سلسلے میں کام کیا اور بہت عمدگی سے اِن چیزوں کو معین فرمایا ہے جو ایک جامع خطبے میں شامل ہونی چاہئیں۔ سب سے پہلے تو اللہ کی حمد وثنا خطبہ کا لازمی حصہ ہے۔ پھر شہادتین کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ آنحضور ﷺ پر درود اِس کا لازمی حصہ ہو۔چوتھی بات یہ فرمائی کہ چونکہ قرآن مجید میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم بار بار آیا ہے اس لیے خطبے میں بھی اس کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ پانچویں بات یہ کہ کچھ آیاتِ قرآنی کی تلاوت اس میں ضرور ہونی چاہیے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو خطبات مرتب کیے' ان میں انہوں نے سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ منتخب کی' چنانچہ خطیب حضرات عام طور پر اسی آیت کی تلاوت کرتے ہیں۔

آنحضور ﷺ کا کوئی ایک معین خطبہ نہیں ہوتا تھا' تاہم خطبہ کے ابتدائی الفاظ کم وبیش ایک جیسے ہوتے جن میں اللہ کی حمد وثنا اور استغفار کا ذکر ہوتا۔ اس کے بعد قرآن کے مختلف مقامات سے آیات تلاوت کی جاتیں اور ان کے حوالے سے تذکیر اور نصیحت ہوتی۔ ہمارے ہاں چونکہ عام آدمی کو عربی سمجھ میں نہیں آتی' لہٰذا قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاصہ پر مبنی مختلف خطبات مرتب کیے گئے۔ ان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خطبات نہایت جامع ہیں' جو پورے برصغیر میں عام ہوئے۔

آنحضور ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے خطیب دو خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر

کے لیے بیٹھتا ہے۔ پہلے اور دوسرے خطبے میں کیا کہا جاتا ہے' اس میں کوئی خاص تخصیص نہیں ہے۔ دونوں کا مقصد وعظ' تذکیر' یاد دہانی اور تعلیم ہے۔ یہاں خطبۂ جمعہ کے عربی متن کا ترجمہ اور مختصر تشریح پیش کرنے کی حقیر سی کوشش کی جارہی ہے' تاکہ اس کے مطالعے کے بعد خطبۂ جمعہ سنتے ہوئے اس کے معانی و مطالب ہمارے ذہنوں میں مستحضر رہیں۔

خطبۂ اولیٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ...اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ : ''کُل حمد وثنا اللہ کے لیے ہے' کل تعریف اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے۔ ہم اس کی حمدبیان کرتے ہیں' اور اس سے مدد چاہتے ہیں'

اور اس سے بخشش و مغفرت طلب کرتے ہیں' اور اس پر ایمان لاتے ہیں 'اور اس پر توکل کرتے ہیں''۔

⋆اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ' اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ: ''کُل حمد وثنا اللہ کے لیے ہے۔ کل تعریف اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے''۔ آج بظاہر تو یہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی جاتی ہے' لیکن شاید اس کی ہمہ گیریت کو محسوس نہیں کیا جاتا۔ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر خیر اور خوبی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ اپنے طور پر نہ سورج کے اندر کچھ اثر ہے' نہ چاند اور ستاروں میں۔

آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ دو کلمات ایسے ہیں جو ربّ کو پہچاننے اور جاننے کے حوالے سے بہت جامع ہیں' ایک سبحان اللہ اور دوسرا الحمدللہ۔ایک حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلتَّسْبِیْحُ نِصْفُ الْمِیْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَؤُہٗ)) یعنی سبحان اللہ سے (معرفتِ ربّ کی) میزان نصف ہو جاتی ہے' جبکہ الحمد للہ سے یہ بھر جاتی ہے۔ (مسند احمد)

سبحان اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ ہر کمی' عیب' نقص اور کوتاہی سے پاک ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی نیک اور صالح کیوں نہ ہو 'اس کی ذات میں کسی نہ کسی اعتبار سے کوئی کمی ضرور ہوگی۔ صرف ایک ذات کامل ہے۔ یہ معرفت ربّ کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ اس کائنات کے حسن اور کمال کا سرچشمہ وہی ایک ذات ہے۔ اصل شکر اُسی کا

واجب ہے۔ قرآن مجید میں جہاں انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی گئی ہے وہاں ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ{اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ} (لقمٰن:۱۴)''شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا''۔ اس لیے کہ والدین کے دل میں رحمت اور شفقت ڈالنے والی ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے!

⋆نَحْمَدُہٗ: ''ہم اسی کا شکر ادا کرتے ہیں''۔ روز مرہ کے معمولات میں اس شکر کے ادا کرنے کے طریقے ہمیں نبی اکرم ﷺ نے بتائے ہیں کہ کھانا کھائو تو اللہ کا شکر ادا کرو (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ) ۔سو کر اٹھے ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ)۔بیت الخلاء سے نکلے ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ) ۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کو جب بھی خیر اور بھلائی پہنچے' اس کی زبان سے اللہ کے لیے کلماتِ تشکر جاری ہو جانے چاہئیں۔

⋆وَنَسْتَعِیْنُہٗ: ''اور ہم اُسی سے مدد چاہتے ہیں'' ۔ ہم اللہ ہی سے اعانت طلب کرتے ہیں۔ جب اللہ کی یہ معرفت حاصل ہو جائے کہ حقیقی رازق' مالک' مشکل کشا اور حاجت روا وہی ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ مانگنا ہے تو صرف اسی سے! چنانچہ خطبۂ مسنونہ میں یہ لفظ ''وَنَسْتَعِیْنُہٗ ''شامل ہے۔ یعنی ہم ہر مشکل میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو شے بھی مانگنی ہو اُس کے لیے اللہ ہی کی طرف دست سوال دراز کرتے ہیں۔

*وَنَسْتَغْفِرُہٗ: ''اور اس سے بخشش و مغفرت طلب کرتے ہیں''۔اگر کوئی غلطی اور کوتاہی ہو جائے' کوئی گناہ سرزد ہو جائے' صراطِ مستقیم سے پائوں ڈگمگا جائیں تو معافی کے لیے بھی اللہ ہی کی جناب میں رجوع کرتے ہیں۔ بندۂ مؤمن کی زندگی کا یہ ایک بہت ہی اہم معاملہ ہے'جسے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۵ میں اس انداز سے بیان کیا گیا کہ : {وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَہُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِہِمْ ۫ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ۫} ''اور وہ لوگ کہ جب کر بیٹھیں کوئی کھلا

12

گناہ یا برا کریں اپنے حق میں تو یاد کریں اللہ کو اور بخشش مانگیں اپنے گناہوں کی۔ اور کون ہے گناہ بخشنے والا سوائے اللہ کے؟''گناہوں کو بخشنے کا اختیار کسی پوپ' پادری یا پیر کے پاس نہیں ہے۔یہ حق صرف اللہ تعالیٰ ہی رکھتا ہے کہ کس کو معاف کرنا ہے اور کس کو نہیں۔ ہم استغفار کے لیے صرف دعا کر سکتے ہیں۔

اسی میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ کسی شخص پر حقیقت منکشف ہونے اور صراطِ مستقیم اختیار کرنے کے فیصلے کے بعد اُس سے کوئی کوتاہی اور خطا سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی جناب میں رجوع کرنے کی صورت میں ایسے شخص کی استغفار ضرور قبول ہوتی ہے۔چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ۱۷ میں فرمایا گیا: {اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ}''اُن لوگوں کی توبہ قبول کرنا اللہ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے جن سے نادانی میں کسی غلطی کا ارتکاب ہوجائے تو پھر وہ توبہ کرتے ہیں جلد ہی''۔ فوری اور سچی توبہ کی شرائط یہ ہیں کہ دل میں پشیمانی کے ساتھ اللہ کے دربار میں استغفار کی جائے' یہ عزمِ مصمم ہو کہ آئندہ یہ کام نہیں ہوگا اور انسان اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش بھی کرے۔ سورۃ الفرقان کی آیت ۷۰ میں ارشاد ہوا کہ: {اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ ؕ} ''مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا اور کچھ نیک کام کیا' تو اللہ اس کی برائیوںکو بھلائیوں سے بدل دے گا۔''

*وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ: ''اور ہم اُس پر ایمان رکھتے ہیںاور اُسی پر ہمارا توکل ہے''۔ ایمان کا اصل حاصل یہی ہے کہ اللہ پر یقین کامل اور توکل ہو۔ توکل کا مطلب یہ ہے کہ جب اسباب کے سارے راستے بند نظر آئیں تب بھی یہ یقین ہو کہ اللہ راستہ نکال سکتا ہے۔ قومی سطح پر آج ہم اس وصف سے محروم ہیں۔ اللہ پر توکل کے حوالے سے قرآن مجید اور آنحضور ﷺ کی سیرت میں متعدد واقعات ملتے ہیں۔

*وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا: ''اور ہم اللہ سے پناہ طلب کرتے ہیں اپنے نفوس کی شرارتوں سے اور اپنی بداعمالیوں سے''۔یہ بڑی عجیب بات

13

ہے! عام طور پر تو شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ النحل کی آیت ۹۸ میں فرمایا گیا: {فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾} ''جب تم قرآن پڑھنے لگو تو اللہ کی پناہ میں آجاؤ شیطان مردود سے''۔ اسی طرح سورۃ الاعراف کی آیت ۲۰۰ میں ارشاد ہوا: {وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ} ''اور کبھی تمہیں شیطان کی چھیڑ اُبھارے تو اللہ سے پناہ طلب کرو''۔ اس کی سب سے عام شکل انسان کا مشتعل ہو جانا ہے۔ یہ بھی ایک شیطانی حملہ ہے' جس سے فوراً اللہ کی پناہ میں آجانا چاہیے لیکن یہاں خطبے میں اس سے آگے بڑھ کر یہ دعا کی جا رہی ہے کہ پروردگار! تو ہمیں ہمارے اپنے ہی نفس کی شرارتوں سے محفوظ فرما۔ درحقیقت اس نفس کے اندر بھی برائی کے محرکات موجود ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ۵۳ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں کہ: {وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ} ''اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا' یہ نفس تو برائی سکھاتا ہے مگر جو رحم کیا میرے ربّ نے۔''

انسان کے نفس کے اندر سرکشی ہے اور یہ حدود اللہ کو پھلانگنے کا رجحان رکھتا ہے۔ شیطان اسی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کا اصل کردار یہی ہے کہ غصہ' انتقام اور شہوت کے حوالے سے انسانی کمزوریوں کو بھڑکائے اور وسوسہ اندازی کرے۔ سورۃ الاعراف میں یہود کی تاریخ کے ایک بہت بڑے ولی اللہ بلعم بن باعوراء کا ذکر ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے روحانی اعتبار سے بہت اونچا مقام عطا کیا تھا' لیکن پھر اس پر زوال آیا اور سب کچھ چھن گیا۔ اس ضمن میں آیت ۱۷۵ میں فرمایا گیا: {وَ اتْلُ عَلَیْہِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْہَا فَاَتْبَعَہُ الشَّیْطٰنُ فَکَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۱۷۵﴾} ''اور انہیں پڑھ کر سنایئے اُس شخص کے احوال کہ جس کو ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں' تو وہ خود اُن سے نکل بھاگا' پھر شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا' تو وہ ہوا گمراہوں میں''۔ یعنی نفس کی اکساہٹ کی وجہ سے وہ خود پٹڑی سے اُتر گیا۔ چنانچہ جب انسان کے اندر معاملات بگڑتے ہیں تب شیطان فائدہ اٹھاتا ہے۔

---

*مَنْ یَّہْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ہَادِیَ لَہٗ: ''جس کسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت سے نوازے تو اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا' اور جسے وہ گمراہ کر دے تو کوئی نہیں کہ جو اُسے راہِ ہدایت پر لا سکے''۔ یہ بھی قرآن مجید کے حوالے سے ایک بہت اہم اصول ہے جو ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔ ہدایت کا اصل اختیار بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس ہے' لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اگر ایک شخص ہدایت کا طالب ہی نہیں تو وہ زبردستی اس کو ہدایت پر نہیں لاتا۔ چنانچہ ہمیں تلقین کی گئی ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں صراطِ مستقیم کی دعا کرتے رہیں: {اِہْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ﴿۵﴾}۔ یہ نہ سمجھیں کہ اگر ہدایت مل گئی ہے تو اب ہمیں اس راستے سے کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی سیدھی راہ پر

برقرار رکھ سکتا ہے۔

ہدایت اور ضلالت کے قانون کی ایک شق سورۃ الحج کی آیت ۱۶ میں بیان کی گئی کہ: {وَ اَنَّ اللّٰہَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یُّرِیۡدُ ﴿۱۶﴾} ''اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہے''۔ اسی حوالے سے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کے آخر میں ارشاد ہوا: {وَیَہۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴿۱۳﴾}''اور (اللہ تعالیٰ) ہدایت دیتا ہے اُس کو جو اُس کی طرف متوجہ ہو''۔ اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی کتاب' اس کے رسولؐ اور اس کے دین کی طرف رجوع لیا جائے۔ یہ نہیں کہ اس سے تو پیٹھ پھیرے رہیں اور پھر کہیں کہ اللہ نے ہمیں ہدایت ہی نہیں دی۔ جیسے حقیقی رازق اللہ کی ذات ہے' لیکن ہم ہاتھ توڑ کے نہیں بیٹھ رہتے' بلکہ جو ملتا ہے اُس سے مزید آگے کے لیے دن رات کوشاں رہتے ہیں' اسی طرح اگرچہ ہدایت دینے کا آخری اختیار اللہ کے پاس ہے لیکن ہمیں صراطِ مستقیم کا طالب بننا چاہیے اور اللہ کا دامن تھام کر اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ جو شخص خود جاگ رہا ہو اور بظاہر سوتا بن جائے' اسے جگانا ممکن نہیں ہے۔ ایسے لوگ جن تک قرآن کی بات پہنچ چکی ہو لیکن پھر بھی وہ اپنے ذاتی مفادات یا کسی اور وجہ سے حق کو قبول نہ کریں' ان کی ضلالت پر اللہ تعالیٰ مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے اور پھر کوئی طاقت انہیں راہِ ہدایت پر نہیں لا سکتی۔ یہی اللہ کا قانون ہے!

اس کے بعد خطبہ میں الفاظ ہیں:

* وَاَشۡہَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ: ''اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ اکیلا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں''۔ یہ توحیدی کلمہ ہے' جس کے ذریعے اس امر کی گواہی دی جارہی ہے کہ اس کائنات میں کوئی قوت نہیں ہے' کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے' کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے سوائے ایک ذات کے۔ وہ تنہا ہے۔ خدائی اور الوہیت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ یہی بات سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۶ میں ان الفاظ میں آئی ہے: {فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی * لَا انۡفِصَامَ لَہَا ؕ} ''پس جس نے انکار کیا طاغوت کا اور ایمان لایا اللہ پر' تو اس نے مضبوط کنڈے کو تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں''۔ یہاں بھی پہلے اس بات کا مکمل انکار ہے کہ غیر اللہ کے پاس کوئی اختیار اور قدرت ہے۔ کسی کے پاس کوئی اختیار ہے بھی تو وہ جزوی اور اللہ کا عطاکردہ ہے' جسے اللہ جب چاہے سلب کر لے۔ کوئی شخص جو بھی عمل کرتا ہے' اس کی منظوری اللہ کی طرف سے آتی ہے تو وہ عمل سرزد ہوتا ہے' ورنہ ہو ہی نہیںسکتا۔

توحید دین ابراہیمی کا طغرائے امتیاز ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ اور امام الناس قرار دیا۔ وہ عقیدے اور عمل دونوں پہلوئوں سے توحید کے امتحان میں پورے اترے۔ توحید کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور یکتائی کا اقرار کیا جائے' ورنہ کائنات کے خالق کے طور پر تو مشرکین

عرب بھی اللہ کو مانتے تھے‘ لیکن انہوںنے کچھ اور ہستیوں کو چھوٹے معبودوںکا درجہ دے کر اللہ کے اختیار میں شریک کر رکھا تھا۔

اسی حوالے سے بعض خطبات میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ وَحِّدُوا اللّٰہَ فَاِنَّ التَّوْحِیْدَ رَأْسُ الطَّاعَاتِ۔ یعنی اللہ کی توحید کے معاملے میں پوری کوشش کرو کہ کہیںاس کے اندر شرک کی آلائش نہ آجائے ‘کیونکہ شریعت میں تمام دینی احکامات کی جڑ بنیاد توحید ہی ہے۔ یہی نہ رہی تو ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق کیا رہ گیا ! لیکن

بدقسمتی سے آج مسلمانوں کی صفوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو دین توحید میں دراڑیں ڈالتے اور اسے مشرکانہ تصورات سے آلودہ کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۶ میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے کہ :{وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُہُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَہُمْ مُّشْرِکُوْنَ ﴿۱۰۶﴾} ’’اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد اللہ پر ایمان نہیں لاتی مگر ساتھ ہی شرک بھی کرتی ہے‘‘۔ لہٰذا اسلام دین توحید ہے !

* وَاَشْہَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ : ’’اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے سردار اور ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ اُس (اللہ) کے بندے اور اُس (اللہ) کے رسول ہیں‘‘۔ یہاں عبد اور معبود کا فرق واضح کر دیا گیا کہ حضرت محمد ﷺ کو بھی ہم اللہ کا ایک بندہ مانتے ہیں‘ لیکن وہ عبد کامل ہیں۔ بقول علامہ اقبال ع ’’عبد دیگر عبدۂ چیزے دگر !‘‘اس گواہی میں رسالت کا ذکر بعد میں ہے جبکہ آنحضور ﷺ کی نسبت عبدیت کو مقدم رکھا گیا ہے۔ معبود تو بس وہی ایک اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے ‘باقی سب اس کے بندے اور غلام ہیں ۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک خاص بندے یعنی حضرت محمد ﷺ کو ایک خصوصی امتیازیوں بخشا کہ انہیں منصب رسالت کے لیے یعنی اپنا پیغام نوع انسانی تک پہنچانے کے لیے چن لیا۔

جو شخص بھی مذکورہ بالا دونوں گواہیوں کو تسلیم کرلے گا‘ وہ اللہ کی نگاہ میں صاحب ایمان ہے۔ ان دونوں کے حوالے سے عملی تقاضوں کو سمجھنا بھی ضروری ہے ! زبان سے گواہی دینا اپنی جگہ لازم ہے اور اس کی اہمیت بھی ہے‘ لیکن اس گواہی کی توثیق عمل سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر اللہ کو معبود اور حاکم مانا ہے تو غلام ہونے کے ناطے ہم پر اُس کا ہر حکم واجب التعمیل ہے۔ اور جب اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو اپنا نمائندہ قرار دے دیا اور یہ فرما دیا کہ میری اطاعت ان کے واسطے سے ہوگی تو آنحضور ﷺ کا ہر فرمان واجب الاطاعت ہے۔ اسی کو قرآن بار بار کہتا ہے کہ اگر تم واقعی ایمان والے ہو تو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ ہر معاملے میں ان کے حکم کے آگے سر جھک جائے۔ یہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے ! اسی طرح ریاست کی سطح پر کلمۂ طیبہ کا تقاضا

یہ ہوگا کہ وہاں قرآن و سنت کی فیصلہ کن بالادستی کو ہر سطح پر قبول کیا جائے۔

اب خطبہ کا اگلا حصہ آرہا ہے۔ یہ الفاظ بھی آنحضور ﷺ ہی کے خطبات سے ماخوذ ہیں۔

* اَمَّا بَعْدُ: ''اس کے بعد...'' یعنی ایک بات مکمل ہوئی' اب دوسری بات شروع ہورہی ہے۔ عربی زبان میں یہ خطبہ کا اسلوب ہے اور خطاب کا ایک مستعمل انداز۔

*فَاِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ: ''یقینا بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے''۔ حدیث کے معنی بات' گفتگو' کلام کے ہیں۔ اس مفہوم میں یہ لفظ خود قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۸۵ میں فرمایا گیا:{ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ } ''سو اِس بات (قرآن) کے بعد یہ کس چیز پر ایمان لائیں گے!'' کیا اب بھی ان پر حق واضح نہیں ہوا؟ اور کون سی شے ہے جو ان پر کارگر ہوگی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام کلاموں میںسب سے اعلیٰ کلام اللہ کا ہے۔

* وَخَیْرَ الْہَدْیِ ہَدْیُ مُحَمَّدٍ ﷺ: ''اور بہترین راستہ حضرت محمد ﷺ کا راستہ ہے''۔ یہ لفظ ہدیہ یا تحفہ کے معنی میں بھی آتا ہے' لیکن یہاں اس سے مراد راستہ' طریقہ اور رہنمائی ہے۔ آنحضور ﷺ نے اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے کلامِ الٰہی کی جو عملی شکل واضح کی' اس اُمت کے لیے وہی بہترین طریقہ اور راستہ ہے۔

* وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُہَا' وَکُلَّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ : ''اور بدترین معاملات وہ ہیں جو (دین میں) نئی باتیں بنا لی گئی ہیں 'اور ہر نئی بات بدعت ہے''۔ یہ بہت اہم اور حساس نوعیت کی بحث ہے۔ مُحدَث کا لفظ بھی حدیث سے بنا ہے۔ حدیث سے مراد زبان سے نکالی گئی کوئی بات یا نیا کلمہ ہے۔ حادثہ یا کسی واقعے کا اچانک رونما ہونا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ دین میں جو نئی باتیں نکالی جائیں' وہ تمام معاملات میں سب سے زیادہ شر انگیز ہیں۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ میں رہبانیت کے بارے میں ابْتَدَعُوْھَاکا لفظ آیا ہے جو دراصل بدعت ہی سے فعل ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: { وَ رَہْبَانِیَّۃَۨ ابْتَدَعُوْہَا مَا کَتَبْنٰہَا عَلَیْہِمْ } ''اور دنیا کا ترک کرنا' جو انہوں

(نصاریٰ) نے نئی بات نکالی تھی' ہم نے ان پر یہ (انجیل میں) نہیں لکھا تھا''۔ عیسائیت میں رہبانیت ایک بدعت ہے' جسے از خود اختیار کرکے دین کا حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔

* وَ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ ' وَکُلَّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ : ''اور ہر بدعت گمراہی ہے' اور ہر گمراہی آگ میں (لے جانی والی) ہے''۔

اس حوالے سے قرآن مجید اور احادیث میں یہ بات آئی ہے کہ اُمتوں میں جب بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو بدعات کی بھرمار ہوجاتی ہے۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ لوگ ان کاموں کو چونکہ حصولِ ثواب کا ذریعہ سمجھ رہے ہوتے ہیں' لہٰذا ان سے بچنے کا کوئی خیال ان کے ذہن میں آتا ہی نہیں۔ پھر ان بدعتوں کو تحفظ دینے والے بھی بہت پیدا

ہو جاتے ہیں۔ وہ علماء یقینا مبارک باد کے مستحق ہیں جنہوں نے یہ الفاظ خطبۂ جمعہ میں شامل کیے۔ واضح رہنا چاہیے کہ اصل ہدایت وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے واسطے سے دی اور جس پر رسول ﷺ نے عمل کر کے اُمت کو دکھا دیا۔ اس سے آگے اگر کوئی خود قدم بڑھانا چاہے اور دین میں نئے نئے اضافے کرنا چاہے تو وہ کوئی خیر کا کام نہیں کر رہا۔

جب بدعات آتی ہیں تو دین کا حلیہ کیوں بگڑ جاتا ہے' اس کی وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس کے کچھ نہ کچھ ایسے ساتھی' حواری اور اصحاب نہ ہوں جو اُس رسول کی سنت کو مضبوطی سے تھامتے اور اس کے ہر حکم کی اقتدا کرتے تھے''۔ قرآن و حدیث کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے سب سے مستند لوگ رسول کے قریبی ساتھی ہوتے ہیں۔ انہوںنے رسول کی سنت کا براہ راست مشاہدہ کیا تھا۔ اگر ان کے عمل میں کہیں کوتاہی ہوتی تو رسول ان کی اصلاح فرماتے تھے۔ لہٰذا اس بات کا فیصلہ کہ کوئی بات دین کا حصہ ہے یا نہیں' ہم اپنی عقل سے نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں آنحضور ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل سے دلیل لانی پڑے گی۔

حدیث مبارکہ کے اگلے حصے میں آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''پھر ایسا ہوتا رہا کہ ہر

نبی کے کچھ عرصہ بعد کچھ ناخلف لوگ آجاتے تھے۔ یہ جو کچھ کہتے تھے اس کے مطابق عمل نہیں کرتے تھے''۔ نا اہل لوگ دینی اور روحانی پیشوا بن جاتے ۔ ایسے لوگ کلمۂ شہادت کو زبان سے تو ادا کرتے ہیں لیکن اس کا لازمی عملی تقاضا ان کی زندگیوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ پوری زندگی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرنے کے بجائے اپنی مرضی سے اورزمانے کے چلن اور رواجات کے مطابق گزاری جا رہی ہے۔ دین کو تقسیم کر کے کسی نے اس کو مسجد تک محدود کر دیا اور کسی نے محض خدمتِ خلق کو اصل کام قرار دے دیا۔ آج اُمت قول و فعل کے اسی تضاد میں مبتلا ہے۔ دوسری بات آنحضور ﷺ نے فرمائی: ''اور وہ کچھ کرتے تھے جس کا انہیں حکم نہیں ہوا''۔ چنانچہ نئی نئی چیزیں ایجاد کر کے اُن کو دین کا حصہ بنا دیا گیا۔

اس کے بعد کے الفاظ یہ ہیں کہ:((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''جو ایسے لوگوں سے قوت کے ساتھ جہاد کرے وہ مؤمن ہے''۔یہ طبقہ اگر حکمرانوں کا ہو تو اُن کے خلاف جہاد کے لیے یہ حدیث بنیاد ہے۔ تاہم مسلمان حکمران کے خلاف خروج کی کچھ شرائط بھی ہیں' جو ایک الگ موضوع ہے۔((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اورجو اپنی زبان سے ان لوگوںکے خلاف جہاد کرے وہ مؤمن ہے''۔ ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو اپنے دل سے ان کے خلاف جہاد کرے وہ مؤمن ہے''۔یعنی جو دل سے اُن چیزوں کو برا جانے

اور ان کے خلاف ایک شدید گھٹن محسوس کرے وہ بھی مؤمن ہے۔ ((وَلَیْسَ وَرَآئَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃٌ خَرْدَلٍ)) ''اوراس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے''۔ یعنی دل میں کڑھن محسوس کرنا ایمان کا سب سے نچلادرجہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو چھوڑ کر اگر دین میں نئی چیزیں نکالی جائیں گی تو وہ شکل و صورت میں چاہے عبادات محسوس ہوتی ہوں، حقیقت میں دینی اعتبار سے انتہائی مہلک ہیں۔

یہ درحقیقت ایک مسلمان اُمت کے زوال کی علامتیں ہیں، جن کا ایک نفسیاتی سبب بھی ہے کہ جب ہم اپنی ایمانی اور عملی کمزوری کے باعث پورے دین پر عمل نہیں کر

رہے ہوتے اور اس کے بہت سارے گوشے اپنی عملی زندگی سے خارج کر دیتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے دل کی تسلی کے لیے دینی انداز کی کچھ ایسی چیزیں درکار ہوتی ہیں جن کی ظاہری شکل و صورت عبادات کی طرح ہو۔ اس نفسیاتی ضرورت کی وجہ سے بدعات کوفروغ ملتا ہے اور یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں، لیکن ان کی وجہ سے دین کا حلیہ بگڑجاتا ہے۔ یہ بات جس نے بھی کہی، حق کہی ہے کہ جب کوئی بدعت آئے گی تو کوئی نہ کوئی سنت رخصت ہوگی۔ بدعات کا معاملہ عقائد میں بھی ہے اور عبادات و رسومات کے اندر بھی!

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں ایجاد ہونے والی روزمرہ استعمال کی جو نئی نئی چیزیں کام میں لائی جاتی ہیں، یہ بھی چونکہ آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دَور مینہیں تھیں، لہٰذا ان کا شمار بھی بدعات میں ہونا چاہیے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ نئی نئی ایجادات سے فائدہ انہیں دین کا حصہ سمجھ کر اور ثواب کی نیت سے نہیں اٹھایا جاتا، بلکہ یہ تو دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے برتنے کی چیزیں ہیں۔ کوئی شخص گھر میں فریج یا اے سی کا استعمال ثواب کے لیے تو نہیں کر رہا ہوتا۔ اصل میں سارے بگاڑ کا آغاز اُس وقت ہوتا ہے جب کسی ایسے کام کو دین کا حصہ سمجھ کر ثواب کے حصول کی خاطر کیا جائے جس کا سراغ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے دَور میں نہ ملتا ہو۔ ایسی چیزیں جب بڑھتی ہیں تو پھر بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں اور معاشرے میں ایک لازم شے کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ پھر جو شخص انہیں اختیار نہیں کرتا، اسے مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے دین میں سنت رسول ﷺ کے حوالے سے کسی شخص کے انتقال کے بعد اہم ترین شے اُس کی نمازِ جنازہ اور تدفین ہے اور اس کے بعد ایک اجتماعی دعا بھی سنت سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ کسی رسم اور تقریب کا کوئی ثبوت نہیں۔ لیکن آج اکثر لوگوں کو نمازِ جنازہ تو یاد نہیں ہے جبکہ سوئم اور چالیسویں کی مجالس میں شرکت لازمی تصور کی جاتی ہے۔ یہ سب چیزیں بعد کے دَور کی پیداوار اور ہندوانہ پس منظر کی حامل ہیں۔ چنانچہ اصل شے غائب ہو گئی جبکہ

بدعات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ان بدعات کی وجہ سے مرنے والے کے لواحقین پر خرچ کا بے پناہ بوجھ پڑتا ہے جو قطعی طور پر ناروا اور ناجائز ہے‘ جبکہ ان کا اصل ’’فائدہ‘‘ صرف ان نام نہاد مذہبی طبقات کو ہوتا ہے جنہوں نے دین کو پیٹ کا دھندا بنا رکھا ہے اور جو دین کے نام پر غریب عوام کا بدترین استحصال کرتے ہیں۔ آنحضور ﷺ اس نوع کے تمام ناروا بوجھوں سے نوعِ انسانی کو نجات دلانے آئے تھے لیکن ہم نے رسومات کا ایک طومار گھڑ کر دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ سورۃ المائدۃ کی تیسری آیت کی رُو سے قرآن نے اس امر کی توثیق کر دی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے جو دین دنیا کو دیا‘ وہ ہر اعتبار سے پورا ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی اس میں کسی قسم کے اضافے کی کوشش کرے گا‘ وہ دین کا حلیہ بگاڑے گا۔

خطبۂ جمعہ کے متذکرہ بالا مسنون کلمات کے بعد کچھ آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہاں کوئی ایک سورت یا رکوع بھی تلاوت کیا جا سکتا ہے یا کوئی جامع آیت ہونی چاہیے جس میں پورا ایک پیغام موجود ہو۔ یہ خطبہ کا لازمی جزو ہے‘ اس لیے کہ آنحضور ﷺ کا خطبہ تو گھومتا ہی آیاتِ قرآنی کے گرد تھا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو خطبات جمعہ مرتب کیے اور جو بہت مقبول بھی ہوئے‘ ان میں انہوں نے سورۃ المؤمن کی ۶۰ ویں آیت خصوصیت کے ساتھ شامل کی ہے اور خطباء حضرات عام طور پر اسی کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ بڑی گھمبیر‘ جامع اور اہم آیت ہے جو ایک اعتبار سے دین کا خلاصہ ہے۔ انفرادی سطح پر ایک شخص کے لیے دین کی راہنمائی کا لبّ لباب بہت جامعیت کے ساتھ اس ایک آیت میں آگیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

* وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ: ’’اور کہا تمہارے رب نے مجھ کو پکارو‘ میں تمہاری پکار کو پہنچوں گا۔‘‘ یہ اصل میں بندگی کی بنیاد ہے کہ دعا کی جائے اور صرف اللہ ہی کو پکارا جائے۔ اسی لیے نماز کی ہر رکعت میں ہم اللہ سے یہ قول و قرار اور عہد کرتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یعنی پروردگار! ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے‘ اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے! جس معاملے میں بھی مدد و اعانت کی ضرورت ہو‘ ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ مفہوم عبادت کا

لازمی حصہ ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) یعنی دعا عبادت کا جوہر ہے۔ عبادت کا ایک ظاہر ہوتا ہے‘ جیسے نماز کی ہیئت میں ایک خاص انداز سے کھڑے ہونا‘ رکوع و سجود‘ قعدہ اور جلسہ شامل ہیں‘ لیکن اس کا مغز اور جوہر اللہ سے التجا کرنا‘ اس سے مناجات اور اسے پکارنا ہے۔ ایک دوسری حدیث کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ چنانچہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کوئی شخص جب مشکل وقت آئے تو رجوع کس کی طرف کرتا ہے! ظاہری اسباب و وسائل کے حوالے سے بعض اوقات ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا کام فلاں شخص کے ہاتھ میں پھنسا ہوا ہے‘ چنانچہ اس تک رسائی کے لیے ہم تگ و دو کرتے ہیں ---

- جبکہ بندگی کا حاصل یہ ہے کہ سب کچھ پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں ہر حال میں اللہ ہی سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہی راستہ کھول سکتا ہے۔ آنحضور ﷺ کا فرمان ہے کہ لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے درمیان ہیں' وہ جس طرف چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ اُسی کی ذات مسبّب الاسباب اور مشکل کشا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کر دیا کہ مجھ ہی سے فریاد کرو' میں تمہاری دعا کو سنوں گا۔

دعا کی قبولیت کے بارے میں حدیث میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ قبولیت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ اگر دنیا میں دعا کی قبولیت کا خود اللہ تعالیٰ کے ہاں فیصلہ نہ ہو تو وہ ایک انسان کے لیے توشۂ آخرت بن جاتی ہے۔ لیکن بندگی کا حاصل یہی ہے کہ دعا اللہ ہی سے کی جائے' کسی اور کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا جائے۔

* اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَہَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ: ''بے شک جو لوگ میری بندگی سے تکبر کرتے ہیں (اور تکبر کی بنیاد پر مجھ سے دعا نہیں کرتے) تو عنقریب وہ جہنم میں ذلیل و رسوا ہو کر داخل ہوں گے''۔ ان الفاظ میں بڑا جلال ہے۔ یہ بھی انسان کی حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی کی ایک کیفیت ہوتی ہے کہ میں اپنے مسائل خود حل کر سکتا ہوں۔ میرے پاس دولت ہے اور میری ایک حیثیت ہے۔ چنانچہ اللہ سے دعا کرنے میں بھی اسے حجاب محسوس ہوتا ہے۔ یہ بے توفیق لوگ ہوتے ہیں۔

خوداعتمادی کا یہ درجہ فرعونیت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے فرعونوں کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن پھر جب انہیں اچانک ہی کوئی ایسی بیماری آپکڑتی ہے کہ جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا تو پھر ان کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب وقتی طور پر انہیں کچھ حیثیت دے دی تو ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ بندگی کی حقیقت یہی ہے کہ انسان کسی بھی مقام پر پہنچ جائے' اس کا ظاہر اور باطن اللہ کے سامنے سربسجود رہے۔ یہی شان سورۃ الکہف میں ذوالقرنین کے قصے میں بیان ہوئی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے وسائل فراہم کیے تھے لیکن وہ اس مقام پر پہنچ کر بھی رب کے آگے جھکنے والا تھا۔ اس میں تواضع تھی کہ میں اپنی سی کوشش تو کر رہا ہوں لیکن ہوگا وہی جو میرا رب چاہے گا۔ یہ ہے بندگی کا انداز! دوسری انتہا یہ ہے کہ انسان کو کچھ مل جائے تو پھر وہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگے۔

ہونا یہ چاہیے کہ اس آیۂ مبارکہ کے علاوہ خطبہ میں جو آیات پڑھی جائیں' ان کی مناسبت اس موضوع سے ہو جس پر اردو میں خطاب کیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ سورۃ الجمعہ کے آخری رکوع کی تلاوت ہو سکتی ہے ۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کی تلاوت بھی کی جا سکتی ہے ۔ یہ اس اعتبار سے قرآن مجید کی جامع ترین آیت ہے کہ پورے نظام کو اللہ کی بندگی کے تابع کیا جائے' جبکہ سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ اس حوالے سے اہم ہے کہ ایک فرد کیسے پوری طرح اللہ کا بندہ بنے!

سورۃ الحدید کی اس آیت کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ پورا اجتماعی نظام توحید کے تابع ہو' اسلام کا نظامِ عدل

و قسط قائم ہو' اللہ ہی کی الوہیت اور حکمرانی تسلیم کی جائے' آسمانی ہدایت کو اپنی عقل کے اوپر مقدم رکھا جائے' اللہ کے ماننے والے دین حق کو قائم کرنے کی ذمہ داری کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ انقلاب کسی اجتماعی نظام کو بدل دینے کا نام ہے۔ انقلابی عمل میں وعظ' نصیحت' تلقین' تعلیم' تبلیغ' یہ سب اپنی جگہ پر بہت ضروری ہیں' اس کا نقطہ آغاز یہی ہے' لیکن اس کے بعد ایک مرحلہ آتا ہے جہاں طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے انسان

جھجکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قتل و خون ریزی کوئی اچھی بات نہیں' طاقت اور اسلحہ کا استعمال کوئی مستحسن کام نہیں۔ لیکن قرآن مجید نے اس آیۂ مبارکہ میں اس تلخ حقیقت کو بالکل عریاں انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کی انقلابی آیات میں بلند ترین مقام سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کو حاصل ہے۔ یہ ان آیات میں سے ہے جن سے آج یہود و نصاریٰ بہت زیادہ خائف ہیں۔ ان کا بس چلتا تو کبھی کے اس آیت کو قرآن مجید سے نکال چکے ہوتے(معاذ اللہ)۔ ہر اسلامی ملک کے اندر ان کے جو ایجنٹ بیٹھے ہوئے ہیں' ان کے ذریعے وہ یہ کوشش تو کر رہے ہیں کہ اس مضمون کی آیات کو نصابِ تعلیم سے خارج کرائیں' قرآن سے نکالنے کا امکان تو ہے نہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

* لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ: ''ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر۔'' جیسے سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا کہ ''اور تمہارا ربّ کہتا ہے'' اسی طرح یہاں بھی اللہ تعالیٰ ہی انسانوں کے ساتھ اپنے ایک خاص معاملے کا ذکر فرما رہے ہیں کہ ہم ہی رسولوں کو بینات دے کر بھیجتے رہے ہیں۔ بینات سے مراد کھلی' واضح' روشن تعلیمات بھی ہیں اور اس کے مفہوم میں معجزات بھی شامل ہیں جن کو دیکھنے سے آنکھیں کھلتی ہیں۔

* وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ : ''اور ہم (رسولوں کے ساتھ) نازل کرتے رہے ہیں کتاب بھی اور میزان بھی۔'' یہی دو الفاظ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۷ میں بھی آئے ہیں کہ : {اَللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَ الۡمِیۡزَانَ ؕ} ''اللہ وہ ہے جس نے نازل فرمائی کتاب حق کے ساتھ' اور میزان بھی''۔ ''میزان'' کے لیے قرآن مجید میں دوسرا لفظ ''دین حق'' آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۳' سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصف کی آیت ۹ میں آنحضور ﷺ کے لیے فرمایا گیا کہ:{ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ}''وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر بھیجا۔'' یہاں لفظ "الکتاب" کی

جگہ ''الھدیٰ'' آیا' یعنی ہدایت کاملہ' مکمل ہدایت' جس سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ ''میزان'' کی جگہ لفظ ''دین حق'' ہے۔ دین کو ہم نظامِ عدل و قسط کہیں گے' یعنی وہ قوانین جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں' اُن کے درمیان باہم حقوق و فرائض کی تقسیم بالکل درست اور منصفانہ ہے۔ دین کے تحت انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں گوشے آجاتے ہیں۔ سچا دین دنیا میں زندگی گزارنے سے متعلق ضابطۂ حیات ہے۔ عدل و انصاف کے اصول اور معاشرے کے لیے درست اقدار کا تعین' جائز وناجائز اور حرام وحلال میں واضح امتیازقائم کرنا' اسی طرح ظلم و استحصال کرنے والے طبقات کو قرارِ واقعی سزا دینے کا نظام قائم کرنا دراصل دین حق کا اصل موضوع ہے۔

اسی کے لیے لفظ میزان آیا۔ یعنی نظام درحقیقت حقوق و فرائض کے ایک توازن کا نام ہے۔ افراد جب مل کر رہیں گے تو ایک طرف فرد کی آزادی ہے 'جبکہ دوسری طرف فرد کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ان کے مابین توازن مطلوب ہے کہ کسی نظام میں میری آزادی اتنی نہ بڑھ جائے کہ دوسرے لوگوں کی آزادی متأثر ہونے لگے۔ ایک خاص طبقے کو حق اتنا زیادہ نہ دیا جائے کہ دوسرے طبقات کا حق غصب ہونے لگے۔ مرد کو وہ حقوق نہ دے دیے جائیں کہ پھر خواتین کے حقوق متاثر ہوں 'یا خواتین کو وہ حقوق نہ دے دیے جائیں کہ مرد کے حقوق تلف ہوتے ہوں۔ مرد اور عورت اگرچہ ایک ہی جنس کی دو اصناف ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے۔ دونوں کو بالکل برابر حقوق دے دینا بھی غیر فطری ہے۔ اس امر کا تعین کون کر سکتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے اور کس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اس سوال کے جواب کو منطقی طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام اگر مرد کرے گا تو وہ عورت کے نفسیاتی تقاضوں' جذبات اور میلانِ طبع سے مکمل طور پر واقف نہ ہونے کی وجہ سے لازماً ایک ایسا نظام بنائے گا جس میں مرد کے حقوق زیادہ رکھے جائیں گے۔ اسی طرح عورت کو اگر نظام بنانے کا اختیار مل جائے تو وہ بھی عدل کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر رہے گی ۔چنانچہ ایک ہی ذات ایسی ہے کہ جو عدل و انصاف کے ساتھ دونوں کے فرائض اور حقوق کا صحیح صحیح تعین

کر سکتی ہے ---- اور وہ ہے جس نے ان دونوں کو پیدا کیا۔ سورۂ ق کی آیت ١٦ میں فرمایا گیا کہ : {وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَ نَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِہٖ نَفۡسُہٗ ۚ} ''اور ہم نے انسان کو تخلیق کیا اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس کیا وسوسہ اندازی کرتا ہے۔'' چاہے مرد ہو یا عورت' انسان کی نفسیات کو سب سے بہتر جاننے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے 'جو العلیم ہے' جو خالق ہے۔ لہٰذا ایک ایسا میزان یا دین حق جس میں ہر ایک کو اس کا جائز حق ملے' صرف اللہ ہی عطا کر سکتا ہے۔

اسی طرح فرد اور اجتماعیت کے اندر توازن کا معاملہ بھی وہی خالق و مالک ہی طے کر سکتا ہے۔دنیا میں کہیں تو ملوکیت اور آمریت اپنے پنجے گاڑ لیتی ہے۔ کوئی آمر مطلق اقتدار پر مسلط ہو جاتا ہے اور لوگوں کو قطعاً کوئی

حقوق حاصل نہیں رہتے۔ نہ انہیں اظہارِ خیال کی اجازت ہوتی ہے' نہ وہ جماعت بنا سکتے ہیں۔ اس طرح کی آمریت اور ملوکیت میں فرد کچلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس معاملہ یہ ہوتا ہے کہ مکمل انفرادی آزادی ہوتی ہے جو آج مغرب میں ہے کہ جو چاہے کرو۔ اسے مادر پدر آزادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرد اور اجتماعیت میں توازن ایک ایسا معاملہ ہے جسے انسان کا خالق و مالک ہی طے کر سکتا ہے۔

انسانی معاشرے میں فرد کی آزادی اور جزا و سزا کے معاملے میں افراط و تفریط ہے۔ اس حوالے سے ایک تصور یہ ہے کہ جس شخص نے جرم کیا' وہ اصل میں ذہنی مریض ہے جسے توجہ کی ضرورت ہے۔ اسے ایک بہتر ماحول فراہم کیا جائے' جہاں اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ چنانچہ جیل کو ایک آسائش گاہ بنا دیا گیا۔ لیکن یہ تجربہ کرکے بھی انسان نے دیکھ لیا کہ جرم پھر بھی کم نہیں ہوئے۔ لہٰذا انسان کا ذہن یا تو ایک انتہا پر جائے گا یا پھر دوسری انتہا پر۔ ان معاملات میں وہ توازن کے راستے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس ضمن میں اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ایک طرف تو مناسب تعلیم اوردرست اقدار کو رائج کرنا چاہیے جو کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری اور علماء کا کام ہے' جبکہ دوسری طرف اگر جرم ثابت ہو جائے تو پھر عبرتناک سزا دی جائے۔ اس کے نتیجے میں معاشرہ

بالکل درست ہو جائے گا! ایسا توازن صرف اللہ ہی عطا کر سکتا ہے۔ لہٰذا دین حق وہ ہے جس میں ہر ایک کو اس کا جائز حق ملے اور پھر وہ دوسرے کے حق پر ڈاکہ نہ ڈال سکے۔ اگر وہ ایسا کرے تو قانون کی زد میں آئے اور اس کو قرار واقعی سزا دی جائے' جبکہ جس کے ساتھ ظلم ہوا ہو' اسے انصاف مہیا کیا جائے۔ اسی کا نام میزان ہے۔

الکتاب یعنی آسمانی ہدایت کا اصل حاصل یہ ہے کہ واضح ہو جائے کہ تم کون ہو' تمہارا خالق کون ہے' اس کی صفات کیا ہیں' تمہاری منزل کیا ہے' خیر کیا ہے' شر کیا ہے' حقیقت کیا ہے' شیطنت کیا ہے' شرک کیا ہے' توحید کیا ہے! اس کے ساتھ ساتھ عملی ہدایت کا ایک گوشہ یعنی میزان الگ کر دیا گیا' جو کہ عدل و قسط کا اجتماعی نظام ہے۔ اس کی رُو سے معاشرتی سطح پر سب انسان برابر ہیں۔ بحیثیت انسان کوئی اونچا یا نیچا نہیں ہے بلکہ سب کا خالق ایک اللہ ہے۔ آدم اور حوا کی اولاد ہونے کے ناطے ان سب کے حقوق برابر ہیں۔پیدائشی طور پر کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہیں ہے۔ یہ نظام حضرت محمد ﷺ نے قائم کرکے دکھایا تھا اور دشمنوں نے بھی گواہی دی کہ واقعتا جو بات آپؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمائی تھی کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی سرخ رو کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں ہے' تو یہ صرف الفاظ نہیں تھے بلکہ اس بنیاد پر عملاً ایک معاشرہ قائم کرکے دکھایا گیا۔ یہ نظام سماجی اور معاشی ہر سطح پر کامل عدل کا ضامن ہے۔ زندگی کی دوڑ میں ہر ایک کو یکساں مواقع فراہم ہونے چاہئیں۔ ملکی وسائل اور دولت کو تمام طبقات میں یکساں طور پر گردش کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ دولت سرمایہ داروں کے طبقے ہی سے نکلے اور گھوم پھر کر وہیں لوٹ جائے جبکہ دوسرے تمام طبقات محروم رہیں۔ ازروئے الفاظ قرآنی : {کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ

} (الحشر:۷) یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص کی صلاحیت ایک جیسی نہیں ہے۔ کوئی اس موقع پر فائدہ اٹھائے گا اور آگے نکل جائے گا جبکہ کوئی پیچھے رہے گا ‘لیکن مواقع تو سب کو یکساں حاصل ہوں۔ یہ معاشی عدل کا تقاضا ہے۔
اسی طرح سیاسی عدل کے لیے ضروری ہے کہ سب کے یکساں حقوق ہوں۔ ہر

مسلمان دوسرے مسلمان کا کفو (ہم پلہ) ہے۔ اس معنی میں قانونی حق کے اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ اس میں اگر فرق آئے گا تو ایک اسلامی ریاست میں بعض پہلوئوں سے مسلمان اور غیر مسلم کا ہو گا‘ لیکن مسلمان سب یکساں ہیں۔ اسی طریقے سے یہ بات بہت اہم ہے کہ خلافت کسی کا پیدائشی حق نہیں بلکہ یہ امرالمسلمین ہے‘ یعنی مسلمان مل کر اپنے میں سے ایک خلیفہ کا تعین کریں۔ تمام مسلمانوں کو اس پر یکساں حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے سے کسی کو خلیفہ کے طور پر منتخب کریں۔ کسی ایک طبقے کو پیدائشی طور پر یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کا مستحق ہو کر بیٹھ جائے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہو‘ اسے فوری اور سستا انصاف میسر ہو۔

آیت کا اگلا حصہ بہت اہم ہے۔

* لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ: ’’تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں۔‘‘ بین السطور میں یہ ہے کہ رسولوں کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس دین حق اور میزان کو نصب کیا جائے۔ دین حق قائم و غالب ہو۔ یہ ’’الکتاب‘‘ اللہ نے اس لیے نہیں دی کہ تم اس کو کبھی کبھی پڑھ لیا کرو۔ کسی عزیز‘ رشتہ دار‘ دوست کا انتقال ہو گیا تو ایک سپارہ پڑھ لیا اور ایصالِ ثواب کر کے آ گئے۔ یا یہ کہ خود عمل تو کرنا نہیں ہے لیکن پھر بھی کبھی کبھی ثواب کے لیے پڑھنے میں کیا حرج ہے‘ آخر ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں تو ملیں گی! الھدیٰ کا صرف یہ مصرف نہیں ہے۔ اللہ نے رسول بھی اس لیے بھیجے‘ کتاب بھی اس لیے نازل کی اور دین حق بھی اس لیے عطا کیا تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں۔ اسی نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ چنانچہ آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ اے نبی! کہہ دیجیے: {وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ} (الشوریٰ:۱۵) ’’مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں!‘‘ یہ میزانِ عدل اس لیے دی گئی تھی کہ اسے نصب کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت کے موقع پر فرمایا تھا: ’’لوگو! تم میں سے جو قوی ہے میرے نزدیک وہ ضعیف ہو گا جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کر لوں‘ اور جو ضعیف ہے

وہ قوی رہے گا جب تک کہ اسے اس کا حق دلا نہ دوں‘‘۔
اس آیت میں رسولوں کو عطا کردہ تین چیزوں (بینات‘ کتاب اور میزان) کا جو حاصل بتایا گیا ہے وہ

اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس نظام کے قائم ہونے کے نتیجے میں لوگوں کو ایسا ماحول میسر آئے گا جس میں ان کی روحانی ترقی کے امکانات ہوں گے۔ اگر یہ میزان نصب نہیں ہے تو وہ معاشرہ استحصالی معاشرہ ہے۔اس کے اندر ظلم ہے' چاہے ظاہری طور پر وہ ایک نہایت خوش نما نظام ہو۔

مغرب سے درآمد شدہ جمہوری نظام کی اصلیت کو علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے پہچانا تھا کہ ع چہرہ روشن' اندروں چنگیز سے تاریک تر۔ بظاہر تو یہ بڑا عمدہ نظام ہے' لیکن جن بنیادوں پر یہ اٹھایا گیا ہے وہ اصل میں چنگیزیت ہے۔ اس نظام میں وہی اوپر آسکتا ہے جس کے پاس سرمایہ ہو گا۔ سرمائے کے ذریعے وہ میڈیا کو بھی خرید سکتا ہے۔ لہٰذا بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ہم نے اپنے ووٹ سے ایک شخص کو اوپر پہنچایا ہے لیکن درحقیقت ہمارے ذہن کو آزاد نہیں چھوڑا گیا بلکہ یہ ذرائع ابلاغ سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ جس کے پاس سرمایہ نہیں ہے' وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس کے مظاہر آج ہم پوری دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔

اسی طرح سودی بنیادوں پر قائم معاشی نظام کو سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے اور ظاہراً یہ بڑا خوشنما نظر آتا ہے' لیکن حقیقت کے اعتبار سے بقول اقبال ؎

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

اس سودی نظام کے نتیجہ میں انسان حیوانیت سے اتر کر درندگی کی سطح پر آجاتا ہے۔ سود خور اصل میں درندے ہیں' وہ انسان نہیں رہتے۔ وہ مروّت' شرافت' رحمت اور شفقت کے جذبات سے قطعاً عاری ہوتے ہیں۔ چاہے اپنے پاس اتنا جمع ہو چکا ہو کہ دس پشتیں کھا سکتی ہوں' لیکن اس سود کی بنیاد پر وہ غریبوں کے کپڑے تک بیچنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہ قانون امریکہ میں سودی نظام کے علمبردار یہودیوں نے بنایا تھا کہ اگر

ایک شخص دیوالیہ ہو جاتا ہے تو پھر حکومت اس امر کی پابند ہے کہ ان سودخوروں کو ان تمام واجبات کی ادائیگی کرے جو اس شخص کے ذمہ تھے' چاہے اس عمل میں اس کا گھر بھی نیلام ہو جائے۔ اسی طرح یہ جو قسطوں پر چیزیں دی جاتی ہیں' ان کی ادائیگی اگر وقت پر نہ ہو تو شرح سود میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس جال میں پھنس کر ہر سال لاکھوں افراد دیوالیہ ہوتے ہیں۔ سود خور چاہتا ہے کہ ہر چیز مجھے مل جائے اور میں اپنا حق وصول کر لوں' اور حکومت اسے یہ سب کچھ دلوانے کی پابند ہے۔ ہاں دیوالیہ شخص کو زندہ رہنے کے لیے حکومتی سطح پر کچھ بنیادی ضرورتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ لیکن اس طرح حکومت کنگال ہو جاتی ہے 'جبکہ سودخوروں کے کھتے بھرتے جاتے

ہیں۔ بہرکیف‘ یہ سودی نظام حقیقت کے اعتبار سے چنگیزیت اور ابلیسیت ہے۔

ایسے بدترین استحصالی نظام میں انسان کو اللہ‘ اس کے دین‘ روحانیت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا خیال کہاں آئے گا! وہ تو اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی تگ و دو میں لگا رہے گا جبکہ سودخور آگے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں رہیں گے۔ لہٰذا اگر یہ دین حق قائم ہو تو اس کے نتیجے میں انسان اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے اور عبدیت کے تقاضے پورے کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ رسولوں کو اسی لیے بھیجا گیا۔

آیت کے اگلے الفاظ نہایت توجہ طلب ہیں:

*وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ : یہ وہ الفاظ ہیں جو یہود و نصاریٰ کو بہت چبھتے ہوں گے۔ ’’اور ہم نے لوہا اتارا‘ اس میں جنگ کی بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں‘ اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کون ہیں جو اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں‘ غیب میں رہتے ہوئے۔‘‘

بأس کا ترجمہ بعض حضرات صرف قوت کر دیتے ہیں کہ ’’اس میں بڑی قوت ہے‘‘ لیکن اس کا حقیقی ترجمہ ’’اسلحہ کی قوت‘‘ ہے۔ اسی لوہے سے تلوار‘ نیزہ‘ ڈھال اور دیگر سامانِ جنگ تیار ہوتا ہے‘ توپ اور ٹینک بھی اسی سے بنتے ہیں۔ فولاد کے کچھ اور کام

بھی ہیں اور استعمال کی بہت سی چیزیں اس سے بن سکتی ہیں لیکن اس کا اصل وصف جنگی صلاحیت ہے۔ لوہے کی قوت اس لیے ہے کہ جو طبقات بھی دین حق کے قیام اور اس میزان کو نصب کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنیں‘ ان کی سرکوبی کے لیے اسے ہاتھ میں لو اور ان کے سر کچل دو۔ اس طرح یہ ثابت کرو کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ کے وفادار ہو۔ رب کی دھرتی پر رب کا نظام قائم کرنے کے لیے میدان میں نکل آئو۔ یہ ہے اصل ہدف جو مسلمانوں کو دیا گیا! نیو ورلڈ آرڈر تاریخ انسانی کا سب سے بڑا شیطانی نظام ہے اور اس کے پیچھے ٹیکنالوجی کی پوری قوت ہے۔ یہی دجالیت کی انتہا ہے‘ جس سے ہر نبی اور رسول نے پناہ مانگی ہے۔ لیکن جو لوگ اللہ اور رسولؐ کے وفادار ہیں‘ ان کی وفاداری کا امتحان یہی ہے کہ وہ نکلیں اور ان طبقات سے نبردآزما ہوں۔ لوہے کی قوت کو ہاتھ میں لے کر دین حق کے قیام کی ہر رکاوٹ کو دور کریں۔ یہ قرآن مجید کی سب سے بڑی انقلابی آیت ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کا طریق انقلاب دو ٹوک انداز میں بیان فرما دیا گیا ہے کہ ہم نے دلیل اور بینہ بھی اتار دی‘ کتاب بھی نازل کر دی اور میزان بھی اتار دی۔ کتاب کی دعوت سے لوگ آپؐ کے قریب آجائیں گے۔ لیکن اب ان کو منظم کر کے ایک طاقت بنانا ہے تاکہ نظامِ باطل سے ٹکرایا جائے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ میزانِ عدل و قسط کو دنیا میں نصب کیا جائے۔ اس آیۂ مبارکہ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر کے انقلابی

لٹریچر میں اس سے زیادہ عریاں انقلابی الفاظ کہیں نہیں ملتے !
* اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ: اور ساتھ ہی فرما دیا کہ یہ واضح رہے کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے' زورآور ہے۔'' اس کا اقتدار پوری کائنات اور کون و مکاں کو محیط ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) کوئی کمزوری لاحق ہو گئی ہے اور اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ وہ تو القوی ہے' بڑی قوت والا ہے' العزیز ہے' زبردست ہے۔ کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ وہ بے بس ہو گیا ہے اور تم سے مدد کے لیے

کہہ رہا ہے ۔ اُس کا ایک حرفِ کُنۡ آنِ واحد میں یہ نظام تلپٹ کر سکتا ہے' لیکن اصل میں تمہارا امتحان پیش نظر ہے۔ یہ تمہاری وفاداری کا امتحان ہے۔ ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی !

اس امتحان میں کامیابی کی صورت میں وہ نعمتیں اور آسائشیں ملیں گی جن تک کبھی کسی کے تخیل کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس امتحان کے ذریعے اگر دین قائم ہو گا تو نوع انسانی کا بھلا ہو گا' انہیں عدل و انصاف ملے گا' انہیں وہ ماحول میسر آئے گا جس میں وہ انسانیت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ترقی دے کر حیوان کی سطح سے بلند ہو سکیں گے۔
ابو دائود کی ایک روایت کے مطابق آنحضور ﷺ اکثر اوقات خطبہ جمعہ میں سورۂ ق پڑھا کرتے تھے اور اس کے حوالے سے تذکیر و موعظت فرمایا کرتے تھے۔ اس سورت کا اصل مضمون توحید' رسالت اور آخرت کے حوالے سے تذکیر ہے۔ بہرحال اب آگے بڑھتے ہیں۔ تلاوتِ آیات کے بعد پہلے خطبے کے آخر میں یہ دعا ہوتی ہے:
* بَارَکَ اللّٰہُ لِیۡ وَلَکُمۡ فِی الۡقُرۡاٰنِ الۡعَظِیۡمِ: ''اللہ تعالیٰ اس قرآن عظیم کے حوالے سے میرے لیے اور آپ سب کے لیے برکت پیدا فرمائے !'' خطبے میں جو آیات ہم نے سنی ہیں اور تذکیر و موعظت حاصل ہوئی ہے' اللہ تعالیٰ اس میں ہم سب کے لیے برکت پیدا فرمائے اور اسے ہمارے لیے خیر کا ذریعہ بنا دے۔
* وَنَفَعَنِیۡ وَاِیَّاکُمۡ بِالۡاٰیَاتِ وَالذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ: ''اور یہ آیات اور حکیمانہ ذکر میرے لیے بھی اور آپ سب کے لیے بھی نفع بخش ہو''۔ یعنی اب ہم ان آیات سے فائدہ اٹھائیں اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنائیں تاکہ یہ ہمارے لیے سود مند ثابت ہوں۔ اس کے لیے بھی اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں اس کی توفیق دے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے' جو الحکیم ہے یعنی انتہائی حکمت والا ! دنیاوی سطح پر بھی بہت سے لوگوں کو حکیم ' دانا اور صاحب فراست کہا جاتا

ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کسی بڑے سے بڑے عالم یا دانشور کی سمجھ بوجھ کا کوئی موازنہ اور تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم اپنی زندگی میں

لوگوں کے اقوال اور فلسفۂ حیات پر عمل کرتے ہیں تو یہ اصل میں خود ہماری محرومی ہے۔ قرآن کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے منبع سے حکمت اور دانائی اخذ کرنے کی کوشش کرنا ہماری اپنی کم نصیبی ہے۔

* اِنَّہٗ تَعَالٰی جَوَّادٌ کَرِیْمٌ مَلِکٌ بَرٌّ رَّئُ وْفٌ رَّحِیْمٌ : ’’یقینا اللہ تعالیٰ انتہائی جود و سخا والا‘ کرم فرمانے والا‘ بادشاہ‘ محسن‘ مہربان‘ رحم فرمانے والا ہے‘‘۔ اللہ تعالیٰ ایسا سخی ہے کہ جو مانگنے سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں کہ اس سے مانگا جائے اور وہ اس پر راضی ہو۔ ذات باری تعالیٰ انتہائی کرم فرمانے والی ہے۔ وہ کون و مکان اور ارض و سماوات کا بادشاہِ حقیقی ہے۔ جو اس کے وفادار ہیں‘ وہ ان کی توقعات پر پورا اترنے والا اور انہیں پورا پورا صلہ دینے والا ہے۔ اس پر توکل کرنے والوں کا وہ مولا اور محافظ ہے۔ رأفت اور رحمت کے الفاظ اصل میں اکٹھے آتے ہیں۔ رأفت سے مراد کسی کے دکھ درد کو محسوس کرنا ہے جبکہ رحمت یہ ہے کہ کسی کی تکلیف محسوس کر کے اس کے ازالے کے لیے کوشش کی جائے۔ اس مفہوم کے حوالے سے اللہ تعالیٰ رئوف بھی ہے اور رحیم بھی ! پہلا خطبہ ان الفاظ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خطیب کچھ دیر کے لیے بیٹھتا ہے۔ بعض احادیث کی رو سے دونوں خطبوں کے درمیان یہ چند لمحات دعا کی قبولیت کے حوالے سے نہایت معتبر ہیں۔ لہٰذا اس وقفے کے دوران اپنے اپنے طور پر دعا کرنی چاہیے۔

خطبۂ ثانیہ

جمعۃ المبارک کے دوسرے خطبے کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے :

* اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی: ’’کل تعریف وثنا اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے‘ اور وہ (اپنے بندوں کی حاجات کے لیے) کافی ہے‘‘۔ ہمارا وجود اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے۔ ہماری مادی اور روحانی ضروریات کا پورا کرنے والا بھی وہی ہے۔ لہٰذا اگر ہم ہر لحظہ اس کا شکر ادا کریں تو بھی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اپنے بندوں کی دعائوں کو سننے‘ ان کی مشکل کشائی کرنے اور ان کی حاجت روائی کے اعتبار سے اُسی کی ذات کافی ہے۔ یہ مضمون سورۃ

الزمر کی آیت ۳۶ کے آغاز میں بھی بڑے پیارے انداز میں آیا ہے۔ آنحضور ﷺ کو تسلی دی گئی کہ: {اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ط} ’’کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے !‘‘ یعنی اگرچہ حالات انتہائی ناموافق ہیں اور سردارانِ

قریش آپؐ کی جان کے دشمن ہو چکے ہیں لیکن اللہ کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر اللہ آپؐ کی پشت پر ہے تو کس بات کا ڈر ہے! اگر دنیا کے تمام طاقتور طبقات اور وقت کے فرعون کسی انسان کے مخالف ہو جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد اُن سب سے مقابلے کے لیے کافی ہے' لیکن اس کی ایک شرط ہے جو قرآن خود بیان کرتا ہے کہ انسان بھی اللہ کا وفادار بنے اور صرف اُسی پر ایمان رکھے' اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور اسی پر توکل کرے۔یہ دو طرفہ رشتہ ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ بھی انسان کو حالات کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھر ایسا انسان اللہ کی حفاظت سے محروم ہو جاتا ہے۔

* وَالصَّلاَۃُ وَالسَّلاَمُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی: ''اور دعا و سلام ان بندوں پر جنہیں اس (اللہ) نے خود چن لیا''۔ اس سے مراد تمام انبیاء کرام علیہم السلام ہیں۔ انہیں اللہ نے ایک بڑے عظیم مقصد کے لیے چنا۔ وہ سب اللہ کے بندے ہیں اور اسی نے انہیں یہ مقام دیا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے سلامتی کی دعا ہے۔

* اَمَّا بَعْدُ: ''اس کے بعد''۔ خطاب کے اندر جب ایک مضمون کے بعد دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے تو یہ کلمہ ادا کیا جاتا ہے۔

* فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ' بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ: قرآن مجید کی آیات کی تلاوت سے پہلے تعوّذ پڑھنا واجب کے درجے میں ہے' اس لیے کہ اس کا حکم خود قرآن مجید میں ہے۔ سورۃ النحل میں فرمایا گیا: {فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾}''جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو' تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ میں آجایا کرو''۔ شیطان کی وسوسہ اندازی سے حفاظت کا ایک ہی راستہ ہے' اور وہ یہ کہ جس ہستی کے تابع وہ ہے اس کی مدد حاصل کی جائے۔ پھر شیطان حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ بصورت دیگر اسے پورا اختیار ہے اور وہ انسان کو گمراہ

کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ چنانچہ قرآنی حکم کے تحت تعوّذ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ ہر اچھے کام کی ابتدا بسم اللہ سے ہونی چاہیے' اس لیے آیاتِ قرآنی کی تلاوت کے آغاز میں بھی بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔

اس کے بعد یہاں خطبۂ جمعہ میں بالعموم سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۶ تلاوت کی جاتی ہے:

* اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۵۶﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر رحمتیں بھیجتے ہیں' اے ایمان والو! تم بھی ان پر رحمت بھیجا کرو اور سلام بھیجا کرو جیسے کہ سلام بھیجا جاتا ہے''۔ اس آیت میں ذکر ہے نبی کریم ﷺ پر درود و سلام بھیجنے کا۔ اللہ کے منتخب کردہ افراد میں

آنحضور ﷺ کا ایک خصوصی مقام ہے کہ وہ خاتم النبیین ‘آخر المرسلین ہیں اور تمام انبیاء و رُسل کے سردار ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔

نسبت کی تبدیلی سے جس طرح لفظ توبہ کے معنی بدل جاتے ہیں‘ اسی طرح یُصَلُّوْنَ کا ترجمہ بھی نسبت کی تبدیلی کے حوالے سے مختلف کیا جائے گا۔ سورۃ التحریم کی آٹھویں آیت کے شروع میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ : {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ط} ’’اے ایمان والو ! توبہ کرو اللہ کی جناب میں سچی توبہ ‘‘۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میںبھی ایک نام ’’التواب ‘‘ہے۔ توبہ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گی تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ اگر کوئی نافرمان اور باغی بندہ اس کی جناب میں رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ رحمت اور شفقت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ لفظ ’’توبہ ‘‘اللہ کے لیے بھی استعمال ہو رہا ہے اور بندے کے لیے بھی‘ لیکن نسبت بدلنے سے اس کا مفہوم بدل گیا۔ اسی طرح لفظ صلوٰۃ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے آئے گا تو علماء نے اس کا مفہوم یہ معین کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضور ﷺ پر مسلسل رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ فرشتوں کی صلوٰۃ کے بارے میں سورۃ المؤمن کی ساتویں آیت میں ذکر ہے کہ :{وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ج} ’’اور وہ سچے اہل ایمان

کے لیے استغفار کرتے ہیں‘‘۔ چنانچہ فرشتے نبی کریم ﷺ کے لیے ہر وقت استغفار اور دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں۔ اہل ایمان کی صلوٰۃ سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر رحمتوں کے نزول اور ان کے درجات کی بلندی کے لیے پروردگار کی بارگاہ میں دعا کی جائے۔ لہٰذا نبی ﷺ پر صلوٰۃ یادرود بھیجنے کا بڑا اونچا مقام ہے۔ یہ نہ صرف بہت بڑی نیکی اور ثواب کا کام ہے بلکہ آنحضور ﷺ سے ہماری محبت کا تقاضا بھی ہے۔

صحیح احادیث میں یہ مذکور ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آنحضور ﷺ سے سوال کیا کہ آپؐ پر سلام بھیجنے کے الفاظ تو ہمیں بتا دیے گئے جو نماز کے تشہد میں شامل ہیں‘ اے اللہ کے رسولؐ ! یہ فرمائیے کہ ہم آپؐ پر درود کیسے بھیجیں۔ اگرچہ صرف ’’صلی اللہ علیہ وسلم ‘‘کہہ دینا بھی درود ہے ‘لیکن صحابہ کرامؓ کے سوال کے جواب میں جو درود آنحضور ﷺ نے تلقین فرمایا ‘ وہ درودِ ابراہیمی ہے۔ یہ سب سے زیادہ فضیلت والا درود ہے جو ہم نماز میں پڑھتے ہیں اور جس کی تلقین خود آنحضور ﷺ نے اُمت کو فرمائی۔ چنانچہ اس آیت کی تلاوت کے فوراً بعد امتثالِ امر کے طور پر خطیب درود پڑھتا ہے۔

* اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ: ’’اے اللہ ! رحمتوں کی بارش نازل فرما حضرت محمد ﷺ پر اور آلِ محمدؐ پر‘‘۔

* کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ: ’’جیسے کہ تو نے رحمتوں کی بارش برسائی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور آلِ ابراہیم ؑپر۔‘‘

* اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ: ''بے شک تو تمام خوبیوں کا مالک اور انتہائی سربلندی والا ہے''۔
* اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ: ''اے پروردگار! برکتیں نازل فرما حضرت محمد ﷺ پر اور آلِ محمدؐ پر''۔
* کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ: ''جیسے کہ تو نے برکت نازل فرمائی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور اُن کی آل پر''۔
* اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ: ''بے شک تو تمام خوبیوں کا مالک اور انتہائی سربلندی والا ہے''۔
لفظ آل کی وضاحت کے ضمن میں صاحب کشاف نے جو تشریح کی ہے' اس کے

مطابق آل اور اہل ایک ہی معنی میں ہیں۔ اہل کے اندر رشتہ دار بھی شامل ہیں اور سارے متعلقین بھی۔ لہٰذا جو آنحضور ﷺ سے جتنا قریب ہے' وہ اتنا ہی اس میں زیادہ شریک ہے۔ لیکن امام رازیؒ نے اس کی جو وضاحت کی ہے' اس کے مطابق لفظ اہل کے اندر زیادہ وسعت ہے' جیسے کسی شہر کے رہنے والوں کو اہل کہا جاتا ہے' جبکہ آل کا تعلق قربت' رشتہ داری اور مصاحبت سے ہے۔ تو آنحضور ﷺ کا جو سب سے زیادہ قریبی حلقہ ہے' چاہے وہ رشتہ داروں کا ہو یا آپؐ کے صحابہ کا' وہ سب آل کے اندر شامل ہیں۔

اس کے بعد خطبے میں چوٹی کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین :کا ذکر ہوتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے بعض صحابہ کا نام لے کر ان کی مدح فرمائی تھی۔ ان میں سے چار کا حوالہ تمام خطباتِ جمعہ میں ضرور دیا جاتا ہے۔ اہل سنت و الجماعت کے نزدیک خلفائے راشدین کی افضلیت ان کی ترتیب خلافت کے مطابق ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوا۔

* اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ: فرمایا: ''میری اُمت میں سے میری اُمت کے حق میں سب سے زیادہ مہربان ابوبکرؓ ہیں''۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنایا تو اسی رحمت کا عکس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں تھا۔ ان کی سیرت کے

بے شمار واقعات سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں واقعہ بدر کے قیدیوں کے حوالے سے ہے۔ اُس وقت آنحضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے ایک ہی تھی کہ ان کے ساتھ نرم معاملہ کیا جائے اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے' یا یہ کہ کوئی قیدی کسی مسلمان کو پڑھا دے تو اسی کو فدیے کے طور پر قبول کر لیا جائے۔

* وَ اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ: ''اور اللہ (کے دین) کے معاملے میں سب سے زیادہ سخت عمرؓ ہیں''۔ جب احکاماتِ دین یا غیرتِ دین کا معاملہ ہو تو سب سے زیادہ سخت اور بے لچک موقف رکھنے والے صحابیٔ رسولؐ حضرت عمر رضی اللہ

عنہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے خلیفہ اور جانشین کے طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ :کو نامزد کیا

تو ان کی طبیعت میں سختی کے حوالے سے بعض صحابہ نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے انہیں تسلی دی تھی کہ جب حضرت عمرؓ پر خلافت کا بوجھ پڑے گا تو یہ سختی اعتدال پر آجائے گی۔ دین کے معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت مزاجی کے بہت سے واقعات ہیں' جن میں سے ایک کا ذکر قرآن مجید میں سورۃ النساء میں ہوا ہے۔ کسی منافق کا ایک یہودی سے کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہودی چونکہ حق پر تھا' اور یہ جانتا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ انصاف سے فیصلہ کریں گے' اس لیے وہ منافق کو کھینچ کر حضور ﷺ کی عدالت میں لے گیا۔ آنحضور ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس پر منافق نے کہا کہ اسے یہ فیصلہ منظور نہیں' حضرت عمرؓ کے پاس چلتے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آ گئے۔ جب حضرت عمرؓ :کو یہ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ فیصلہ دے چکے ہیں جسے منافق نے قبول نہیں کیا' تو انہوں نے تلوار نکالی اور یہ کہتے ہوئے اس منافق کا سر قلم کر دیا کہ جسے اللہ کے رسول ﷺ کا فیصلہ منظور نہیں اس کے لیے پھر یہی فیصلہ ہے۔

* وَاَکْثَرُھُمْ حَیَآءً عُثْمَانُ: ''اور ان میں سب سے زیادہ با حیا عثمانؓ ہیں''۔ شرم و حیا انسان کی شخصیت کا ایک خوبصورت رنگ ہے اور نہایت قابل قدر وصف ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ :کو انتہائی ممتاز مقام حاصل تھا۔

* وَاَقْضَا ھُمْ عَلِیٌّ : ''اور ان میں سب سے بڑھ کر درست فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں''۔ یعنی معاملات کی سمجھ بوجھ کے حوالے سے سب سے زیادہ صاحب صلاحیت شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

یہ وہ سرٹیفیکیٹس ہیں جو آنحضور ﷺ نے اپنے قریبی صحابہ کو عطا کیے۔

اس کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح میں کبھی کبھی ایک حدیث اور بھی یہاں پڑھی جاتی ہے' جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرتب کردہ خطبات میں شامل ہے۔ صحابہ کرامؓ کی فضیلت اور مرتبے کے حوالے سے یہ بہت اہم حدیث ہے۔ فرمایا:

* اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ لاَ تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِیْ : ''میرے اصحاب کے

معاملے میں اللہ کا خوف کرو' میرے بعد تم انہیں تنقیص کا نشانہ مت بنانا''۔ یہ درست ہے کہ صحابہ بھی معصوم نہیں ہیں' کسی اجتہادی معاملے میں ان سے غلطی ہو سکتی ہے' لیکن ان پر بدنیتی کا شبہ کرنا ان کی توہین و تنقیص ہے۔

ویسے بھی اجتہادی معاملے میں غلطی گناہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر' خلافت سنبھالتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ جیش اُسامہ کو' جسے آنحضور ﷺ نے اپنی حیات کے آخری ایام میں تیار کیا تھا' بھیجا جائے یا روکا جائے۔ بعض صحابہ کی رائے یہ تھی کہ اسے نہیں جانا چاہیے' کیونکہ ابھی بہت سے فتنے سر اٹھا رہے ہیں اور معاملات کو سنبھالنے میں دیر لگے گی۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کر دیا کہ آنحضور ﷺ کا تیار کردہ یہ لشکر ہر صورت میں جائے گا۔ اس قسم کے فیصلوں کے بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں کہ یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط' لیکن بہر صورت اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ جب ایک شخص خلوص سے کوئی اجتہادی فیصلہ کرتا ہے تو اس پر بھی اجر ہے' چاہے نتیجہ کے اعتبار سے وہ غلط ہو جائے۔ علمی طور پر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں وقت فلاں صحابی سے اجتہادی طور پر غلطی ہوئی' لیکن تنقیص یہ ہے کہ ان کی نیت پر حملہ کیا جائے۔ اس کی اجازت نہیں ہے۔ جب قرآن نے یہ گواہی دے دی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کو اتنا راسخ کر دیا ہے کہ کفر' گناہ اور فسق سے ان کو طبعاً کراہت ہو چکی ہے' اس طرف ان کا اب رجحان ہی نہیں ہے تو اُن پر بدنیتی کا حملہ کرنا ایمان کے منافی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور ﷺ کے تربیت یافتہ افراد ہیں۔ اُن پر الزام تراشی دراصل توہین رسالت سے کم نہیں۔ اس ضمن میں انتہا یہ ہے کہ کوئی ظالم ان کو غاصب اور منافق کہے!

اسی حدیث کے اگلے الفاظ یہ ہیں:

* فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ: ''جو اُن سے محبت رکھتا ہے' وہ میری محبت کی وجہ سے اُن سے محبت رکھتا ہے''۔

* وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ: ''اور جو اُن سے بغض رکھتا ہے' وہ میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے''۔ یعنی اس کا اصل بغض مجھ سے ہے۔ اس

حدیث مبارکہ کی رو سے یہ واضح ہو گیا کہ جو لوگ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعینکی قدر کرتے ہیں' وہ دراصل حضور ﷺ سے محبت کرنے والے ہیں اور جو اُن سے بغض رکھیں' ان کی نیتوں پر حملہ کریں' انہیں اپنے لاشعور میں جھانکنا چاہیے۔ اصل بغض انہیںحضور ﷺ سے ہے' جس کا غصہ وہ صحابہ کرامؓ پر نکال رہے ہیں۔

اس کے بعد خطبے میں جو حدیث آپ بالعموم سنتے ہیں' اس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ آنحضور ﷺ نے اپنے خطبہ میں یہ الفاظ ادا نہ کیے ہوں۔

* لاَ اِیْمَانَ لِمَنْ لاَ اَمَانَةَ لَهٗ وَلاَ دِیْنَ لِمَنْ لاَ عَهْدَ لَهٗ: یہ بہت جامع حدیث ہے۔ ''جس شخص کے اندر دیانتداری کا وصف نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں۔ اور جس کے اندر عہد کی پاسداری نہیں اس کا کوئی دین نہیں''۔ یہ ایمان اور دین کو ناپنے کا ایک نہایت مؤثر پیمانہ ہے جو حضور ﷺ نے مقرر فرمایا۔ اسے ہر شخص اپنے اوپر لاگو کرے' دوسروں پر نہیں۔ امانت داری کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کو امین سمجھ کر ایک چیز آپ کے پاس رکھوا رہا ہے' اب اگر

آپ اس میں خیانت کرتے ہیں تو گویا آپ یہ سمجھ کر ایسا کر رہے ہیں کہ ایسی کوئی ہستی نہیں ہے جو آپ کے اس عمل کو دیکھ رہی ہو اور آپ کی پکڑ کر سکے۔ اگر اللہ پر اور آخرت پر ایمان ہے تو یہ بے ایمانی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا امانت میں خیانت فی الاصل ایمان ہی کی نفی ہے۔ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی نے پیسے یا کوئی قیمتی اثاثہ آپ کے پاس رکھوا دیا' بلکہ ذمہ داری کے مناصب بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ کسی بھی منصب کا حلف اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ پوری ذمہ داری' ایمان داری اور غیر جانبداری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے جائیں۔ اس میں اقربا پروری' سفارش' رشوت' کوتاہی کا عمل دخل بالکل نہ ہو۔ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو پھر امانت میں خیانت ہو رہی ہے۔ آنحضور ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا کہ جس شخص سے آپ مشورہ طلب کرتے ہیں' وہ بھی صاحب امانت ہے۔ اس پر اعتماد کر کے آپ نے اسے امین بنایا ہے۔ اب اس امانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ واقعتا پوری سنجیدگی سے غور و فکر کر کے

جو چیز آپ کے لیے بہتر سمجھے' وہی مشورے کے طور پر پیش کرے۔

عہد کی پاسداری کے حوالے سے یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارا دین تو نام ہی عہد کا ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان یہی عہد ہے جس کو ایک اور انداز میں سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ کے آغاز میں خوبصورتی سے بیان کیا گیا کہ: {اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ} ''اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے''۔ اللہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ جان اور مال اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کے دین کی خدمت کے لیے لگیں ۔ جو شخص انسانوں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا نہیں کر رہا وہ اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو کہاں خاطر میں لائے گا ! چنانچہ یہ ایمان اور دین کے عملی تقاضے ہیں جنہیں نبی کریم ﷺ نے خوبصورتی سے بیان کر دیا۔

خطبے کے آخری حصے میں عام طور پر چند دعائیں شامل ہوتی ہیں۔

* اَللّٰھُمَّ انْصُرِ الْاِسْلَامَ وَالْمُسْلِمِیْنَ: ''اے اللہ ! نصرت فرما اسلام کی اور مسلمانوں کی بھی''۔

* اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ : ''اے اللہ ! ہر اُس شخص کی مدد فرما جو حضرت محمد ﷺ کے (لائے ہوئے) دین کی مدد میں لگا ہوا ہے اور ہمیں بھی ان میں شامل فرما''۔ جو لوگ بھی دین حق کو پورے کرۂ ارضی پر قائم کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں' وہ سب اس دعا میں شامل ہیں۔ دعا کے آخری الفاظ بتا رہے ہیں کہ دعا کرنے والے کا اپنا ارادہ اور نیت بھی ہونی چاہیے کہ وہ بھی ایسے لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر اللہ اور رسولؐ کے دین کی نصرت کے اس عظیم مشن میں اپنا حصہ ڈالے اور اس راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی امکانی کوشش کرے۔

* وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ/ اَعْرَضَ عَنْ دِیْنِ مُحَمَّدٍﷺ: یہاں دو الفاظ لائے جاتے ہیں: ''اور ہر اُس شخص کو ذلیل و رسوا کر دے جو دین محمد ﷺ کو رسوا کر رہا ہو' یا جو دین محمد ﷺ سے اعراض کرے۔''

* وَلاَ تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ : ''اور ہمیں ان لوگوں کے ساتھ کبھی شریک نہ کیجیو''۔ ہم کبھی غلطی سے بھی ان لوگوں کے ساتھی نہ بن جائیں جو حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین کی رسوائی کا موجب بن رہے ہوں۔ درحقیقت اسلام کی رسوائی یہود کے دل کی آرزو ہے۔ لہٰذا ان کے کہنے پر جو کچھ کیا جائے گا' وہ اس دین محمد ﷺ کی رسوائی کا سامان ہوگا۔ چنانچہ آج ہماری حکومت یہود و نصاریٰ کے دباؤ میں آکر اسلام کے جہادی تصور اور دینی اقدار کا جو حلیہ بگاڑ رہی ہے تو یہ دراصل دین محمد ﷺ کو رسوا کرنے کا موجب بن رہی ہے اور اللہ کے غضب کو دعوت دے رہی ہے۔

* عِبَادَ اللّٰهِ' رَحِمَكُمُ اللّٰهُ' اِتَّقُوا اللّٰهَ : ''اے اللہ کے بندو! اللہ تم پر رحم فرمائے' اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''۔ اللہ سے ڈرو' اصل قوت وہی ہے۔ اصل سپریم پاور وہی ہے۔

اس کے بعد سورۃ النحل کی آیت ۹۰ کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خطبہ جمعہ میں شامل کیا اور ان کے دَور سے اب تک یہ اس کا حصہ چلی آرہی ہے۔ اس آیت کا شمار قرآن مجید کی جامع ترین آیات میں ہوتا ہے:

* اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿ ۹۰ ﴾

اس آیت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے' فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر خیر اور شر' یعنی وہ تمام باتیں کہ جن کو کرنے کا حکم ہے اور ہر وہ چیز جس سے منع کیا گیا ہے' ان سب کو جامعیت کے ساتھ اس ایک آیت میں سمو دیا ہے۔ گویا یہ قرآن حکیم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ سورۃ النحل ہی میں قرآن کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں: {تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ} کہ اس میں ہر چیز کی وضاحت موجود ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ یہ آیت اس دعوے کی ایک بہت بڑی گواہی اور ایک واضح ثبوت ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے تین اوامر کا ذکر فرمایا: {اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی} ''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا' احسان کا اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا''۔ اسی طرح تین چیزوں سے منع کردیا: {وَیَنْهٰی

عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ ۚ} ''اور اللہ منع کرتا ہے بے حیائی کے کاموں سے' تمام منکرات سے اور سرکشی و طغیانی سے ۔''جس چیز کو فطرتِ انسانی ناگوار محسوس کرتی ہے یا وہ کام جس کے کرنے سے آپ کا ضمیر ملامت کرتا ہے' وہ سب چیزیں منکرات میں شامل ہیں۔ اور اپنی حدود کو پھلانگنا اور دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا سرکشی ہے۔

اب اس آیت کی تشریح کی طرف آتے ہیں۔ تفسیر عثمانی میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد' اعمال' اخلاق' معاملات' جذبات' اعتدال و انصاف کے ترازو میں تلے ہوں' افراط و تفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوں۔ جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے ''۔ یہ ہے پہلا لفظ: {اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ} کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے عدل کا ! اور عدل ان تمام پہلوئوں کو محیط ہے۔

عقائد میں عدل کیا ہے؟ اس کائنات میں سب سے بڑی حقیقت ''توحید'' ہے جو عقلی طور پر بھی ثابت ہے۔ جتنا زیادہ انسان مشاہدہ کرے گا اس کون و مکاں میں' زمین و آسمان میں اور مظاہر فطرت میں تو ایک بات لازماً پختہ ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ کوئی ایک حکمت 'کوئی ایک ارادہ 'کوئی ایک اختیار ہے جو اس تمام نظام کے پیچھے کارفرما ہے۔ سورۃ الانبیاء میں بڑے سادے انداز میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان فرمایا: {لَوۡ کَانَ فِیۡہِمَاۤ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ۚ}(آیت ۲۲) ''آسمانوں اور زمین میں اگر ایک سے زیادہ الٰہ (معبود) ہوتے '(ایک سے زائد با اختیار ہستیاں ہوتیں) تو یہاں فساد برپا ہو جاتا''۔ اگر مختلف خالق ہوتے تو ہر ایک اپنی مخلوق کو لے کر کائنات کے تخت حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے زور

آزمائی کرتا‘ کھینچ تان ہوتی‘ اقتدار کی رسہ کشی ہوتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جتنی آگے بڑھے گی‘ اتنی ہی یہ بات پختہ ہوگی کہ اس سارے نظامِ کائنات میں ایک ہی حکمت‘ ایک ہی ارادہ‘ ایک ہی

مشیت اور ایک ہی اختیار کار فرما ہے۔ اس حقیقت کا اقرار عقیدے اور نظریے کا عدل ہے اور اس سب سے بڑی حقیقت کا انکار سب سے بڑی نا انصافی ہے‘ جسے شرک کہا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں صاف اعلان کر دیا گیا : {اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾} (لقمان)’’شرک سب سے بڑا ظلم ہے‘‘۔ یہ سب سے بڑی نا انصافی ہے‘ کیونکہ اتنی جلی حقیقت کا انکار کرنا دراصل اللہ کے معاملے میں ظلم و زیادتی کے مترادف ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ مشرک کی کوئی بخشش نہیں۔ ہاں موت سے پہلے اگر اس نے توبہ کر لی اور توحید پر آگیا‘ تو اللہ تعالیٰ بخش دے گا‘ لیکن اگر اسی شرک کے ساتھ مر گیا تو وہاں اس کے لیے کوئی معافی نہیں۔یہ ضابطہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں دو مرتبہ بیان فرمایا ہے: {اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۚ}(آیت ۴۸ و۱۱۶) ’’اللہ تعالیٰ اس کو ہر گز نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا‘‘۔ یہ ظلم کی وہ شکل ہے کہ اس کے لیے کوئی معافی نہیں‘ اور ہونی بھی نہیں چاہیے‘ کیونکہ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا‘ مسجودِ ملائک بنایا‘ اسے عقل عطا کی اور اسے سماعت و بصارت دی‘ اسے شعور دیا اور وہ اتنی بڑی حقیقت کا انکار کر رہا ہے‘ ڈھٹائی کے ساتھ جھٹلا رہا ہے۔ ایسے شخص کے لیے کوئی معافی نہیں ہے۔ ہاں اس سے کم تر گناہوں میں سے جس کو چاہے گا‘ بخش دے گا‘ یہ اس کی اپنی صوابدید اور ضابطہ ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اس سے کم تر گناہوں پر جری ہو جائے کہ وہ تو بخش ہی دیے جائیں گے۔ بہرحال عقائد میں عدل توحید کا اقرار ہے کہ اللہ ایک ہے‘ تنہا ہے‘ کوئی اس کا ساجھی اور شریک نہیں‘ کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ اس عقیدے میں عدم اعتدال کا نام شرک ہے۔

اس سے آگے چلیے‘ اعمال میں عدل کیا ہوگا؟ جب اللہ کو مان لیا اور اللہ سے عہد کیا: {اِیَّاکَ نَعۡبُدُ}’’اے پروردگار ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور ہمیشہ کریں گے‘‘ تو اب عدل کا تقاضا ہے کہ اس عہد کو پورا کیا جائے۔ حقوق اللہ بھی ادا ہوں اور حقوق

العباد بھی۔ جن چیزوں کو اللہ نے فرض اور واجب قرار دیا‘ اگر اس میں ہم نے ڈنڈی ماری تو عدل سے پھر گئے۔ جو فرائض اور واجب اللہ کی طرف سے معین ہو چکے ہیں‘ اس میں کمی کا ہمارے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ کوئی شخص کہے کہ میں نماز تو نہیں پڑھتا اور بہت سے نیک کام کرتا ہوں تو وہ عدل کی پٹڑی سے اترا ہوا ہے۔ اعمال میں عدل یہ ہوگا کہ تمام فرائض اور واجبات کو ادا کرنا اور جو حرام کام ہیں‘ یعنی جن اُمور سے روک دیا گیا ہے ‘ان سے باز

آجانا۔ یہ عدل کا تقاضا ہے۔

معاملات میں عدل کیا ہوگا؟ آپس کے معاملات میں توازن کی روش اختیار کرنا۔ مثلاً کسی سے جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا کیا جائے‘ کسی سے کوئی امانت کا معاملہ ہے تو اس میں خیانت نہ کی جائے۔ عدل کے مضمون کو قرآن مجید میں آخری منطقی انتہا تک پہنچایا گیا ہے‘ چنانچہ سورۃ النساء میں فرمایا: {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ}’’اے اہل ایمان! عدل و انصاف کو قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ‘‘۔ کس حد تک عدل و انصاف پر قائم رہنا ہے‘ فرمایا:{وَ لَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۚ}(آیت ۱۳۵) ’’اگر (عدل و انصاف کی بات) خواہ تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین کے خلاف یا تمہارے رشتہ داروں کے خلاف بھی جاتی ہو تب بھی عدل پر قائم رہو‘‘۔ اس لیے کہ انسان بالعموم یہاں پر ڈنڈی مار جاتا ہے۔ وہ اپنے تولنے کے باٹ کچھ اور رکھتا ہے اور دوسروں کو کسی اور باٹ سے تولتا ہے۔ معاملات میں عدل یہ ہے کہ سب کو ایک ہی باٹ سے تولو۔ اگر محبت ہے تو اس کی وجہ سے ڈنڈی نہ مار جانا۔ اگر کوئی بات رشتہ داروں کے خلاف جاتی ہو‘ خود اپنے خلاف جاتی ہو‘ یا والدین کے خلاف جاتی ہو‘ بہرصورت حق کا ساتھ دیا جائے۔ یہ نہیں ہے کہ چونکہ فلاں ہمارا رشتہ دار ہے‘ ہماری پارٹی کا ہے لہٰذا خواہ وہ حق پر نہ بھی ہو تب بھی اسی کے پلڑے میں وزن ڈالنا ہے۔ یہ عدل نہیں ہے۔ عدل وہ ہے جو حضور ﷺ نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی آپؐ کی عدالت میں فیصلے کرانے آتے تھے۔ قرآن حکیم نے اس معاملے کے دوسرے رُخ کو بھی واضح کر

یا کہ کسی کی دشمنی کی وجہ سے بھی تم عدل و انصاف سے نہ ہٹ جانا۔ فرمایا: {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۫ وَ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ}(المائدۃ:۸) ’’مسلمانو! کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے عدل و انصاف کے گواہ بن کر‘ اور دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم راہ عدل سے ہٹ جاؤ‘‘۔ یہ ہے معاملات کا عدل۔

اخلاقیات میں عدل کیا ہوگا؟ ایک دوسرے کا احترام‘ ایک دوسرے کی عزت۔ کسی کی عزتِ نفس پر حملہ نہ کیا جائے‘ ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی آپ کی عزتِ نفس پر حملہ کرتا ہے‘ آپ کے ساتھ زیادتی کرتا ہے تو عدل کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بھی اتنا ہی بدلہ لیں‘ اس سے تجاوز نہ کریں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: {وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُہَا ۚ}(الشوریٰ:۴۰) قرآن نے یہ اصول دے دیا کہ ’’برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے‘‘۔ یعنی تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرے تو تم بھی اسی کے مثل‘ جتنی اس نے زیادتی کی ہے‘ اس کے ساتھ زیادتی کر سکتے ہو‘ اس سے زیادہ کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اس حوالے سے سورۃ المائدۃ کی یہ آیت بڑی مشہور ہے: {وَ کَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ فِیۡہَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ۙ وَ الۡعَیۡنَ بِالۡعَیۡنِ وَ الۡاَنۡفَ بِالۡاَنۡفِ وَ الۡاُذُنَ بِالۡاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الۡجُرُوۡحَ قِصَاصٌ ؕ}

(آیت ۴۵) یعنی کسی نے آنکھ پھوڑی ہے تو جواباً اس کی آنکھ پھوڑی جا سکتی ہے' دانت توڑا ہے تو دانت توڑا جا سکتا ہے' جس طرح کا زخم لگایا اس کے بدلے میں زخم لگانے والے کو اسی طرح کا زخم لگایا جائے گا۔ یہ ہے عدل ! اگرچہ احسان اس میں کیا ہے؟ وہ ہے معاف کر دینا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

اب آگے آئیے ! جذبات میں بھی عدل مطلوب ہے۔ انسانی جذبات کی بہت سی صورتیں ہیں۔ غصہ بھی ایک جذبہ ہے 'اس میں بھی عدل چاہیے۔ انسان غصے سے بالکل پاک ہو جائے یہ بھی کوئی مطلوب شے نہیں ہے۔ اس طرح غیرت و حمیت بھی ختم ہو جائے گی۔ اگر ایک مؤمن دیکھ رہا ہے کہ شریعت کے اصول اور احکام پامال ہو

رہے ہیں' دینی قدروں کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں تو اس پر اس کا خون کھولنا چاہیے' چہرے کا رنگ تو متغیر ہونا چاہیے۔ لیکن اس صورت حال میں عدل کیا ہوگا؟ عدل اس میں یہ ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لیے آنحضور ﷺ نے جو طریقہ کار اختیار فرمایا' اس پر عمل پیرا ہوا جائے۔ یہ نہیں کہ ایک دفعہ نکلے' چند نعرے لگائے اور اپنے جذبات کا اظہار کر کے فارغ ہو گئے' گویا ہم نے حق ادا کر دیا۔ بہرحال غصے کے اندر بھی اعتدال کی ضرورت ہے' اور اس کے لیے ہمیں سیرتِ رسولؐ اور سیرت صحابہؓ سے رہنمائی لینی ہوگی۔ یعنی غصہ میں انسان بے قابو نہ ہو جائے 'بلکہ اس کا اظہار صحیح جگہ پر اور صحیح طریقے پر ہو۔

اسی طرح نیکی بھی ایک جذبہ ہے' اس میں بھی اعتدال مطلوب ہے۔ حضور ﷺ نے اس کی بھی مثالیں قائم فرمائیں اور اُمت کو تعلیم دی۔ ایک صحابیؓ نے کہا کہ میں انفاق فی سبیل اللہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں نیکی کا جذبہ اتنا بیدار ہوا کہ کہنے لگے میں اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں۔ آنحضور ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا 'بلکہ فرمایا کہ اپنی اولاد اور ورثاء کے لیے بھی تو کچھ رکھو۔ یہ نہ ہو کہ کل تمہاری اولاد دست سوال دراز کرتی پھرے۔ انہوں نے کہا کہ میں آدھا دے دیتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا :یہ بھی قبول نہیں۔ پھر انہوں نے کہا :ایک تہائی دے دیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں یہ قبول ہے اور یہ بھی بہت ہے۔ یہ ہے نیکی میں اعتدال۔ اس ضمن میں تین صحابہؓ کا واقعہ نہایت اہم ہے۔ ان پر نیکی کا بڑا غلبہ ہوا۔ اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن میں سے بعض کی خدمت میں وہ حاضر ہوئے اور آنحضور ﷺ کی نفلی عبادات کے بارے میں سوال کیا کہ آپؐ رات کو کتنا قیام کرتے ہیں؟ نفلی روزے کتنے رکھتے ہیں؟ وغیرہ۔ انہیں بتایا گیا کہ آنحضور ﷺ کچھ وقت رات کا آرام بھی کرتے ہیں اور رات کا ایک بڑا حصہ کھڑے بھی رہتے ہیں۔ آپؐ نفلی روزے بھی رکھتے ہیں اور ناغے بھی کرتے ہیں۔ کبھی نفلی روزے رکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اب شاید مسلسل ہی رکھیں گے اور کئی دفعہ ناغہ کرنے پر آتے ہیں تو مسلسل ناغہ ہوتا ہے۔ جو صورت حال تھی وہ ازواج

مطہراتؓ نے سامنے رکھ دی۔ حدیث میں الفاظ آتے ہیں کہ اُن تینوں نے اپنے خیال میں اسے کم تصور کیا۔ وہ اس سے زیادہ کی توقع لیے ہوئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اپنے آپ کو قائل کیا کہ چونکہ آنحضورﷺ معصوم عن الخطا ہیں اور اگر کسی درجے میں خطا کا کوئی امکان ہو بھی تو قرآن میں یہ بات آ گئی کہ آپﷺ کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف ہیں' لہٰذا آپؐ کے لیے تو اتنا کافی ہے' لیکن ہمیں اس سے کچھ بڑھ کر کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایک نے طے کر لیا کہ میں تو ساری عمر شادی نہیں کروں گا' بس اللہ سے لو لگاؤں گا۔ دوسرے نے طے کیا کہ میں ساری رات کھڑا رہوں گا' اپنی کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ تیسرے نے طے کر لیا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا' کوئی ناغہ نہیں کروں گا۔ اب بظاہر یہ نیکی کا جذبہ اور خیر کا کام ہے اور بڑے اُونچے عزائم ہیں' لیکن اعتدال دیکھئے جو حضورﷺ نے اُمت کو تلقین فرمایا۔ آپﷺ کے علم میں جب یہ بات آئی تو آپؐ نے ان تینوں کو بلایا' اس لیے کہ اس معاملے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا' کیونکہ اس سے غلط روایت پڑ سکتی تھی۔ آپؐ کے چہرے سے بھی اس روش پر ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا اور آپؐ کے الفاظ سے بھی ناراضگی واضح ہوتی ہے۔ فرمایا: ((وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ)) ''اللہ کی قسم! میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں''۔ یہ غیر معمولی الفاظ ہیں' لیکن اس معاملے کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے آنحضورﷺ نے یہ انداز اختیار فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی آپﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ' فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) (۱) ''لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' (رات کو) نماز (تہجد) بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پس جسے میرا طریقہ پسند نہیں ہے (جو مجھ سے بھی آگے جانے کی کوشش کر رہا ہے) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ اسلام یہ تعلیم نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کو کچل ڈالے اور اس دنیا سے بالکل

---

(1) صحیح البخاری کتاب النکاح،باب الترغیب فی النکاح

کٹ جائے۔ ہمارے دین کی رہبانیت ایک ہی ہے' اور وہ جہاد و قتال کے لیے گھر بار چھوڑ کر نکلنا ہے۔ اس میں ظاہر بات ہے کہ وقتی طور پر انسان گھر بار چھوڑتا ہے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر جاتا ہے۔ دنیا کو ترک کرنے کی صرف یہ

شکل ہے کہ جو اللہ کو پسند ہے کہ آدمی جہاد و قتال کے لیے ' غلبہ دین کے لیے گھر بار سے نکلے۔ لیکن نیکی میں بھی عدل و اعتدال ضروری ہے اور اس معاملے میں ہمارے لیے اُسوۂ کامل نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے۔

یہاں تک بات ہوئی عدل کی کہ کس طرح عقائد' اعمال' اخلاقیات اور جذبات میں عدل کی ضرورت ہے 'اور صرف ایک لفظ ''عدل'' میں کتنی وسعت ہے۔ اس آیت میں دوسرا حکم اللہ نے احسان کا دیا۔ احسان کیا ہے؟ علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ نے اپنی تفسیر میں بہت جامعیت کے ساتھ اس کی بھی وضاحت فرما دی کہ ''انسان بذاتِ خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے' مقامِ عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر' فضل و عفو اور تلطف و ترحم کی خو اختیار کرے۔ فرض ادا کرنے کے بعد تطوع و تبرع کی طرف قدم بڑھائے ''۔ میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ فضل کیا ہے ؟ایک شخص سے آپ نے طے کیا کہ وہ آٹھ گھنٹے کام کرے گا اور اس کی مزدوری سو روپے ہوگی۔ عدل یہ ہے کہ اس نے آٹھ گھنٹے کام کیا تو آپ نے سو روپے اس کو دے دیے۔ احسان کیا ہے؟ یہ دیکھتے ہوئے کہ کام اچھا کیا ہے' محنت سے کیا ہے' آپ اس کی اجرت دیتے ہوئے مزید اپنی طرف سے دس بیس روپوں کا اضافہ کر دیں' یہ احسان ہے۔میں نے عدل کے معاملے میں وضاحت کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے کہ تمام فرائض اور واجبات کو ادا کرنا عدل کا تقاضا ہے۔ اس پر نفل کا جو اضافہ ہوگا وہ احسان ہے۔ فرض نماز کے علاوہ سنتیں اور نوافل بھی ادا کرے ۔ فرض روزے کے علاوہ بھی روزے رکھے۔ انفاق کے ضمن میں عدل یہ ہوگا کہ ٹھیک ٹھیک زکوٰۃ ادا کی جائے ۔ اس سے زیادہ اگر وہ اللہ کے دین اور اس کی مخلوق پر خرچ کر رہا ہے تو یہ احسان ہے ۔

اس سے آگے تفسیر عثمانی میں یہ الفاظ ہیں کہ احسان یہ ہے کہ ''انصاف کے ساتھ

مروّت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی وہ کرے گا اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ ادھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا''۔ یہ ساری بات اللہ سے عہدِ بندگی کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ ہم نے اللہ کو اپنا رب مانا {اِیَّاکَ نَعۡبُدُ} اور اقرار کیا کہ اسی کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھیں گے۔ {وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ}اور یہ مانا کہ قرآن اس کا کلام ہے' اس کی دی ہوئی ہدایت ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اصل منزل آخرت ہے' یہ دنیا دارالامتحان ہے' اب میں جتنا زیادہ کروں گا' اتنا بدلہ پاؤں گا۔ ایک تو فرض اور واجب ہے جس کے بارے میں بازپرس ہو گی 'اس سے زیادہ جو کچھ کر رہا ہوں یقینا اس کے بدلے وہاں زیادہ ملے گا۔ یہ احسان کی روش ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:{ھَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ ﴿۶۰﴾}(الرحمٰن)

عقائد اور ایمان کے اعتبار سے بھی احسان کی تعریف حدیث میں آئی ہے۔ عدل تو یہ ہے کہ انسان شرک سے بچ جائے' توحید پر کاربند رہے۔ لیکن یہ توحید یعنی اللہ پر ایمان' یقین اور توکل جب اس درجے کا ہو جائے

لہ((اَنْ تَعْبُدَ اللہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ ' فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ)) (۱) یعنی ''تم اللہ کی بندگی ایسے کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو'' (ہر وقت اللہ کی موجودگی کا احساس رہے) پھر اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو (کم از کم یہ احساس ہر وقت رہے کہ) وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے'' ۔ تو یہ درجہ 'احسان ہے۔ اس جذبے کے ساتھ انسان جو بھی بندگی کرے گا' اس میں خوبصورتی اور نکھار پیدا ہوگا۔ نماز فرض ہے' اگر آپ نماز پڑھتے ہیں اس احساس کے ساتھ کہ میں اس وقت اللہ کی نگاہ میں ہوں اور میں اللہ سے ہم کلام ہو تو اس نماز میں جو حسن پیدا ہوگا وہ درجہ احسان کا ہے۔

معاملات میں بھی احسان کا معاملہ ہوتا ہے۔ کسی شخص سے آپ نے قرض لیا اور اس میں اگر طے کر لیا کہ واپسی اضافے کے ساتھ ہوگی تو یہ سود ہے اور انتہائی سنگین اور بھیانک جرم ہے۔ جبکہ عدل یہ ہے کہ جتنا قرض آپ نے کسی کو دیا تھا' اتنا ہی واپس

---

(1)صحیح البخاری،کتاب الایمان،با سؤال جبریل النبیﷺعن الایمان والاسلام والاحسان ۔وصحیح مسلم،کتاب الایمان،باب الایمان والاسلام والاحسان

لیں' جتنا کسی سے لیا ہے اتنا ہی واپس کریں۔ لیکن اس میں احسان کیا ہے؟ حضورﷺ کا معمول تھا کہ کسی سے کچھ قرض لیتے واپس لوٹاتے ہوئے اپنی مرضی سے اس میں کچھ بڑھا دیتے تھے۔ طے نہیں تھا کہ بڑھانا ہے۔ یہ تطوع ہے۔ یعنی تم ایک مشکل وقت میں میرے کام آئے تھے' میں اپنی مرضی سے تم کو اضافی رقم دے رہا ہوں ۔ یہ معاملات کے اندر احسان کی شکلیں ہیں۔

اس آیت میں تیسری بات یہ فرمائی : {وَ اِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی}''(اللہ حکم دیتا ہے) رشتہ داروں کو (اُن کے حقوق) ادا کرنے کا''۔ قریبی رشتہ دار دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ مستحق ہیں ۔ یہ کام زیادہ مشکل ہوتا ہے' اس لیے کہ عام طور پر قریبی عزیزوں کے ساتھ شکوے شکایتیں بھی ہوتی ہیں۔ چوتھے محلے جا کر خیرات بانٹنا آسان ہے۔ یہ صلہ رحمی کا حکم ہے کہ رشتہ داروں' والدین' بہن بھائیوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ محلے داروں' پڑوسیوں اور دوسرے مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی دراصل عدل و احسان کے تحت آتی ہے' لیکن رشتہ داروں کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے' عدل و احسان میں ان کو مقدم رکھا جانا چاہیے' اس لیے اس کو علیحدہ سے نمایاں کر دیا۔

یہ تین باتیں ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا۔ اس کے بعد تین سے منع فرمایا۔ ارشاد ہوا: {وَیَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ

الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ} فَحْشَاء سے مراد ہر قسم کی فحش بات اور بے حیائی ہے۔ شیطان اس راستے سے انسان کو صراطِ مستقیم سے بچلاتا اور راہِ حق سے منحرف کرتا ہے۔ ''منکر'' ہر وہ شے ہے جو معروف کے خلاف ہو۔ فطرتِ انسانی جس سے کراہت محسوس کرے' جسے ناگوار محسوس کرے' ایسی سب چیزیں منکرات میں شامل ہیں۔ کسی کا دل دکھانا' کسی کو دھوکا دینا' بد عہدی کرنا' امانت میں خیانت کرنا' جھوٹ بولنا' غلط بیانی کرنا' کسی کا مذاق اڑانا' ملاوٹ کرنا' سود اور جوا یہ سب منکرات ہیں' ان سے روک دیا گیا۔

'' وَ الْبَغْیِ'' سے ہر قسم کی طغیانی اور سرکشی مراد ہے۔ کسی دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا' والدین کے سامنے سر اٹھانا' اساتذہ کی بے ادبی کرنا' یہ سب طغیانی اور

سرکشی کی شکلیں ہیں۔ طغیانی کی سب سے بڑی شکل وہ اجتماعی نظام ہے جو اللہ کی بغاوت پر مبنی ہے' جو آج پوری دنیا میں رائج ہے۔ اِس وقت دنیا میں اللہ کے خلاف بغاوت' سرکشی اور طغیانی کا معاملہ اپنے عروج پر ہے۔ سیاسی سطح پر سیکولرازم دراصل '' اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ﴿۲۴﴾ '' کا نعرہ ہے کہ ہم نہیں مانتے کہ کوئی اللہ ہے' کوئی خالق و مالک ہے' اگر ہے بھی تو وہ وہیں آسمانوں میں رہے۔ زمین میں اپنا نظام' اپنا دستور اور اپنے قوانین ہم خود بنائیں گے' یہاں ہمیں اللہ کی مداخلت ہر گز گوارا نہیں ہے۔ یہ ہے سیکولر نظام۔ اسی طرح معیشت میں سود کا نظام ہے' جس کے بارے میں قرآن میں ہے کہ اگر سود نہیں چھوڑتے تو اللہ اور رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ آج پوری دنیا نے سود اختیار کیا ہوا ہے۔ اللہ اور رسول ؐ کے خلاف محاذِ جنگ دانستہ طور پر کھولا گیا ہے۔ یہ ہے طغیانی اور سرکشی۔ معاشرتی سطح پر آجائیں۔ بے حیا مادر پدر آزاد معاشرت' تہذیب اور کلچر عام ہے۔ یہ شیطانی تہذیب ہے' کیونکہ فحاشی شیطان کا ہتھکنڈہ ہے' جسے قرآن نے بایں الفاظ واضح کیا:{اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ} (البقرۃ:۲۶۸)'' یہ شیطان ہے جو تمہیں فقر سے ڈراتا ہے (اور اس طرح انفاق سے روکتا ہے) اور حکم دیتا ہے تمہیں فحشاء کا''۔ یہ شیطانی کلچر ہے جو آج ہمارے گھروں تک پہنچا ہوا ہے' وہ کیبل کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں ہو۔ ہم انفرادی طور پر بھی فحاشی کو فروغ دے رہے اور ہمارے حکمرانوں نے بھی ہر چیز کے دروازے کھول دیے ہیں۔ شیطانی تہذیب ہو یا شیطانی نظام' آج تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اس نظام اور کلچر کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ بہرحال جن چیزوں سے اللہ نے روکا ہے انہیں ہم سینہ زوری کے ساتھ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان سے بچنا ضروری ہے۔

آگے فرمایا: {یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾}''اللہ تمہیں نصیحت کر رہا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو (ہوش میں آئو)'' یہ ساری باتیں اس لیے بیان نہیں کی گئی ہیں کہ انہیں ایک کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دو' یا

ان کو محض اجر و ثواب کے لیے پڑھ لو' بلکہ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ جن کاموں سے روکا گیا ان سے رک

جائو اور جن کو کرنے کا حکم دیا گیا ان کو انجام دو۔ اگر تم مسلمان ہو تو یہ لازمی تقاضا ہے۔

اب اسی آیت کے تناظر میں ہم آج کے اپنے ماحول کو دیکھیں۔ ہم جشن بہاراں منانے چلے ہیں جبکہ دنیا میں کیا حالات ہیں ! انسانیت سسک رہی ہے۔ ''سونامی'' کی صورت میں عذاب الٰہی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں' لیکن ہمارے لچھن وہی ہیں۔کیا ہم بھی اللہ کے کسی عذاب کا انتظار کر رہے ہیں؟ سونامی طوفان کے ہاتھوں لاکھوںانسان لقمۂ اجل بنے' جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔یہ ایک نقشہ ہے۔ دوسرا نقشہ یہ ہے کہ امریکہ افغانستان اور عراق میںمسلمانوں کا قتل عام کر رہا ہے اور اب ایران پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔یہ دین سے دُوری اور اللہ کے دین کو قائم نہ کرنے کی سزا ہے کہ آج مسلمان ملکوں کی حالت ایسے ہے جیسے بھیڑوںمیںسے کسی ایک بھیڑ کو پکڑ کر قصاب ذبح کرتا ہے 'پھر دوسری کو 'پھر تیسری کو' اور بھیڑیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ اس قصاب کے خلاف مل کر کوئی مشترکہ لائحہ عمل مرتب کر سکیں اور اس کی سفاکیت کے خلاف کھڑی ہو سکیں۔ بس وہ انتظار کر رہی ہوتی ہیں کہ اب کس کی باری ہے۔یہی نقشہ ہمارا ہے۔ اب امریکہ کا رُخ ایران کی طرف ہے۔ پہلے خیال تھا کہ شام کی باری آئے گی 'لیکن اس نے اپنا رُخ ایران کی طرف کر لیا ہے۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے جس وجہ سے وہ ایران آیا ہے' اس وجہ سے پاکستان میں آنا اس کا لازمی حصہ ہے۔ اس نیوکلیئر ٹیکنالوجی میں ہم ایران سے چار قدم آگے کھڑے ہیں۔ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کسی مسلمان ملک کو مل جائے 'یہود و نصاریٰ کو یہ قطعاً گوارا نہیں۔

دہشت گردی کے خلاف جو عالمی مہم ہے وہ دراصل اسلام اور مسلمانوںکے خلاف ہے۔ امریکی حکومت کے جو بیانات آج کل آ رہے ہیں ان میں اس بات پر شدید اندیشہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کہیں دہشت گردوں اور بنیاد پرستوں کے ہاتھ نہ چڑھ جائیں۔ امریکہ دراصل اسی بہانے کی آڑ میں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔وہ کبھی ہمارا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے ربّ کو راضی کر کے اس کی مدد حاصل کی جائے۔ لیکن

ہمارے لچھن کیا ہیں؟ جشن بہاراں منایا جا رہا ہے' بسنت منائی جا رہی ہے ' میرا تھن ریس ہو رہی ہے' جبکہ اس وقت اس بڑے دشمن کے مقابلے میں قوم کو جگانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ایک طرف ہم پانچ فروری کو کشمیریوں کے ساتھ یوم یکجہتی منانے کا عزم رکھتے ہیں تو دوسری طرف چھ فروری کو ہندوئوں کا تہوار بسنت منانے کی قومی سطح پر تیاریاں کر رہے ہیں۔ کیا ہم اللہ کے غضب کو دعوت نہیں دے رہے؟ بسنت تو ایک عنوان

ہے‘اس عنوان کی آڑ میں جوافراتفری اور فحاشی کا ارتکاب ہوتا ہے‘ ان سب کو آپ ذہن میں لائیے۔ کیا ہم اللہ کے غضب کو دعوت نہیں دے رہے؟ لہٰذا حکومت سے التماس ہے کہ وہ بسنت منانے اور جشن بہاراں کا انعقاد چھوڑ کر پتنگ کی ڈور کی فروخت پر مستقل پابندی عائد کرے اور علامہ اقبال اور قائداعظم کے تصورات کے مطابق مملکت خداداد پاکستان میں دین حق کے حقیقی قیام اور شریعت کے نفاذ پر کمربستہ ہو جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ کریں اور اصلاحِ حال پر کمربستہ ہوجائیں۔ اس کا صرف اور صرف یہ طریقہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں سمیت ہر شخص پہلے اپنی ذات پر اور پھر ملک میں حقیقی اسلام نافذ کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو جائے۔

* اُذْکُرُوا اللّٰہَ یَذْکُرْکُمْ وَادْعُوْہُ یَسْتَجِبْ لَکُمْ: ’’تم اللہ کو یاد رکھو‘ وہ تمہیں یاد رکھے گا‘ اور تم اس سے دعا کرو‘ وہ تمہاری دعا قبول کرے گا‘‘۔ اللہ کو یاد رکھنا یہ بھی ہے کہ زبان سے اللہ کا ذکر ہو اور ایک شکل یہ ہے کہ ہر وقت اس بات کا خیال رہے کہ کہیں اللہ کا کوئی حکم تو نہیں ٹوٹ رہا۔ جب تم ایسا کرو گے تو اللہ بھی تمہیں بے کس و بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا۔

* وَلَذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی اَعْلٰی وَاَوْلٰی وَاَھَمُّ وَاَکْبَرُ : ’’اور یقینا اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر سب سے بلند‘ سب سے مقدم‘ سب سے اہم اور سب سے بڑا ہے‘‘۔

* وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: ’’اور جو کچھ تم کرتے ہو‘ اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے‘‘۔

یہاں خطبہ جمعہ مکمل ہو گیا۔ اس خطبے کے ذریعے سے جو ہدایت اور موعظت ہمارے سامنے آئی ہے‘ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اس کے مطابق استوار کر سکیں۔ آمین!